دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۲ | ماہ رجب المرجب ۱۴۴۶ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۲۵ء | عدد ۲

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

دنیا اور ملک عزیز کے حالات، مسائل اور مصائب کا ذکر ایک لامتناہی سلسلے میں بدل گیا ہے، وقت کی شناخت بدلتی رہتی ہے، سن و سال کے اعداد بدلتے جاتے ہیں مگر عمومی لحاظ سے انسان جن منزلوں سے گزر رہا ہے، اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ انسانیت اپنی راہ سے بھٹک کر صرف انتشار اور پراگندگی کے عالم میں ہے اور امن و سکون اور اطمینان سے بہت دور جاچکی ہے۔ دنیا اور ملک کے حالات پر گہری نظر رکھنے والوں کا زاویہ کیا ہے؟ اور وہ دنیا کو درپیش مسائل کی سنگینی کو کتنی اہمیت دیتے ہیں؟ یہ سوالات اپنی جگہ لیکن ملک عزیز میں سیاست کے نام پر بنیادی انسانی حقوق و فرائض کی پامالی اور مذہب کے نام پر زیادہ تعداد والوں کے جبر کے جواز کی وکالت اور اس کے لیے فرضی افسانوں کو تاریخی سچائی میں ڈھالنے اور پھر ان کو سستی تشہیر کے ذریعہ عام کرنے کا عمل جس دیدہ دلیری سے ایک فن میں بدلا جارہا ہے۔ آخر اس کے نتائج بد سے ملک و قوم کو کس طرح آگاہ کیا جائے اور اس سے بھی زیادہ کس طرح بربادی و تباہی سے بچایا جائے؟ ان سوالات کے درمیان فطری اور بجا طور پر ملک کی سب سے بڑی اقلیت کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اسی جنوری کے مہینے کے اخباروں کے پہلے صفحہ پر ہجومی تشدد، کرفیو، مسجدوں کے انہدام، مسلم بستیوں کی تاراجی، سپریم کورٹ کے غصے اور سخت تنبیہوں کے باوجود، عدالتی اور قانونی احکام کی پامالی اور حد یہ کہ عدالتوں میں انصاف کی سب سے بڑی کرسی پر بیٹھنے والوں کی غیر منصفانہ ہی نہیں، ظلم و جبر کی کھلے عام پیروی کی خبریں گویا روزمرہ کے معمولات کا حصہ بن گئیں۔ اب تو ان زخموں کے شمار کا بھی حوصلہ ہے نہ فرصت۔ انسانوں کی تاریخ میں ایسی مثالیں کم نہیں بلکہ بہ کثرت ہیں کہ انسانوں کی کسی جماعت نے اپنے وحشیانہ جوش اور عددی تفوق اور کید و مکر کی ارزانی سے کسی مقصد کو حاصل کرلیا ہو، لیکن یہی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ پھر انجام کیا ہوا؟ اقتدار اور حکومت حاصل کرلینا اپنی جگہ لیکن اصل کامیابی تو مقصد کی بقا میں ہے اور اس کے لیے انسانی اخلاق اور اس کے مسلمہ اصولوں پر مبنی کردار ضروری ہے۔ یہ نہیں تو مقصد اپنی بقا کا ضامن ہو ہی نہیں سکتا۔ ہندوستان کی ہی تاریخ ایسی مثالوں سے خالی نہیں، ہمارے اصحاب نظر نے اودھ کی سلطنت، روہیلوں کی ریاست، سکھوں کی شاہی اور مرہٹوں کی پیشوائی کی تاریخ میں عبرت کی داستانیں دیکھیں اور دکھائیں بھی۔ اور یہ نکتہ بھی واضح کیا کہ مختلف عناصر کے مختلف طبقات کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ اور ملک کی ترقی اور اس کے استحکام کے لیے ہر ذاتی منفعت اور ہر شخصی مفاد سے خود کو الگ رکھنے کی خوبی اگر نہیں تو پھر محض ایک قوم کے جذبات کو برانگیختہ کرکے

اور نعروں اور وعدوں کے جوش و خروش کو پیدا کر کے ملک کی تعمیر ہو ہی نہیں سکتی۔

***

یہ ساری باتیں برحق لیکن جس قوم اور امت پر عجب وقت پڑا ہے اور جس کا بیڑہ تباہی کے قریب آن لگا ہے، سوال اس کے لیے ہے کہ اس کی حفاظت کا کیا سامان ہے اور ہو گا؟ جواب بار بار دیا گیا کہ اس امت کے لیے ہر حال میں عقائد و اعمال کی درستی، زندگی کے مقصد کا تعین اور زندگی کے ہر مسئلہ اور ہر شعبہ میں اسلام کے بخشے ہوئے نظام کی تقلید اور پیروی ہے یہی سچائی ہے اور اس سچائی کے اثر کو دیکھنے کے لیے دلوں میں سچی تڑپ اور نہ ٹھہرنے والا دل کا درد مطلوب و مقصود ہے۔

***

درد اور اس کا درماں، مرض اور اس کا نسخۂ شفا، عذاب اور اس سے نجات کے لیے سامانِ رحمت یہ سب امت کے پاس ایک ایسے نوشتے کی شکل میں ہے جو اعتبار و اعتماد کی ہر کسوٹی پر بے عیب و بے ریب ہے، وہی نوشتہ قرآن کی شکل میں آج بھی تنہا ہادی و رہنما ہے۔ گذشتہ دنوں انگریزی ترجمہ و تشریح کے ساتھ قرآن مجید کے پیام ہدایت و رحمت اور سامان نور و شفا کی ایک کوشش مدیر معارف ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کے "دی گلوریس قرآن" کی شکل میں آئی اور عرصہ بعد دارالمصنفین میں ایک علمی تقریب میں بدل گئی، اس کی ایک مختصر خبر اور ترجمہ کی ضرورت اور اس کی خوبیوں پر ایک سیر حاصل تبصرہ اسی اشاعت میں ہے۔ یہاں اس کے ذکر سے مقصود، انگریزی ترجمہ کی ضرورت کے بارے میں دارالمصنفین اور معارف کی آرزو اور اس کے لیے ترغیب و تحریض کی چند یادوں اور باتوں کو سامنے لانا ہے۔ معارف نے قریب نوے سال پہلے کہا تھا کہ انگریزی میں قرآن مجید کے ترجمے بہت ہیں مگر یہ نامسلمانوں کے ہیں اور اعتبار کے لائق نہیں، ایک اور ترجمہ ہے جو قادیانی ہوتے ہوئے بھی نیچریت سے زیادہ متاثر ہے۔ اس پر بھی عام مسلمانوں کو اعتبار نہیں ہے اور ایک اور ترجمہ الہ آباد سے آیا اس میں ترجمہ ہی میں اجتہاد کی ایسی شان دکھائی گئی کہ نہ عربی لغت کا اعتبار رہا نہ تفسیر نبویؐ کا لحاظ اور نہ اسلام کے مسلمہ اصول کا خیال۔ ایسے میں بہتر ترجمہ کے لحاظ سے پکتھال ہی پر نظر جاتی ہے، لیکن وہ حواشی سے خالی ہے اس لیے تبلیغ و تقسیم میں زیادہ کام میں نہیں آسکتا۔ اسی فکر نے معارف کو مولانا عبدالماجد دریابادی سے درخواست کرنے پر آمادہ کیا کہ وہ اس بار گراں کو اٹھائیں، ترجمہ مستند ہو، متقدمین مفسرین کی تحقیق کے مطابق حواشی ہوں اور موجودہ تقاضوں کے مطابق شکوک و شبہات کو بھی دور کیا جائے، ساتھ ہی معارف نے اصل چیز کی جانب توجہ دلائی کہ قرآن مجید کو معنوی تحریف سے بچایا جائے۔ عین اسی وقت معارف کو معلوم ہوا کہ عبداللہ یوسف علی بھی ترجمہ کر رہے ہیں، پہلا پارہ شائع ہوا

تو انگریزی داں مسلمان فضلا نے اس کی فصاحت و خوبی و بلندی کی متفقہ تعریف کی۔ معارف کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تاویلات کی گمراہی سے اس میں کلیۃً احتراز کیا گیا ہے اور معجزات کو عقلی حماقتوں کا بازیچہ گاہ نہیں بنایا ہے، اہل زبان مفسرین سے مدد بھی لی گئی اور اسرائیلیات کی جگہ خود بائبل کے حوالے دیے گئے، عبد اللہ یوسف علی کے ترجمہ قرآن کے متعلق یہ ابتدائی تاثر تھا، بعد میں معارف کے شذرات میں زیادہ ذکر مولانا دریابادی کا رہا۔ ۱۹۴۰ء میں اطلاع دی گئی کہ وہ اس فرض سے بحمد اللہ سبکدوش ہوگئے اور اس طرح کہ یہ اہل سنت کے خیالات کے مطابق پہلا ترجمہ بن گیا ہے، بعد میں پھر لکھا گیا کہ تفسیر ماجدی میں ترجمہ حاصل مراد اور مطلب کا نہیں کیا گیا، بلکہ پوری لفظی پابندی کی گئی ہے۔ اس درمیان خبریں آئیں کہ مصر میں قرآن پاک کے ترجمے کے متعلق ہنگامہ برپا ہے کہ یہ ناجائز ہے یا پھر واجب ہے، سید صاحب نے لکھا کہ خدا رحمت بھیجے، شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان پر کہ انہوں نے ترجمہ کرکے ہندوستان کے مولویوں کو اس جھگڑے سے بچا لیا ورنہ عجب نہیں کہ یہاں جواز و عدم جواز سے بڑھ کر شاید کفر و اسلام کا معیار قرار پاجاتا۔ بعد میں عبد اللہ یوسف علی کے ترجمہ اور ترجمانی میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی گئی، اردو داں طبقہ ظاہر ہے ان کو کیا سمجھتا، ایسے میں ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے اس ضرورت کو محسوس کرکے اصلاحات کا عمل شروع کیا لیکن یہ عمل محض چند مقامات پر رک جانے کا نہیں نکلا، نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے خود یہ ایک جدا اور ہزاروں حواشی پر مشتمل ترجمہ و تشریح بن گیا اور نوے سال پہلے سید صاحب نے معارف میں جس ترجمہ کی تمنا کی تھی وہ آرزو پوری ہوئی اور اب تو اس کی اہمیت اس لیے بھی کہیں زیادہ ہے کہ یہ عبد اللہ یوسف علی کے اصل خیالات و عقائد کی تردید بھی ہے اور تصحیح بھی۔

***

یہ مہینہ ملک و ملت کے لیے شہر الحزن بن گیا، دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظر عام اور عربی اور اردو کے نامور اہل قلم مولانا جعفر مسعود ندوی کے انتقال کی خبر صاعقہ اثر بن گئی، موٹر سائیکل کے ایک حادثہ نے ان کی اور ان کے ایک شناسا کی فرقت کا داغ دیا۔ ایک اور خاموش صاحب علم ڈاکٹر عماد الحسن آزاد فاروقی نے اس دار فانی کو الوداع کیا اور چند دنوں پہلے مقبول شاعر و ادیب جناب تابش مہدی کے رخصت ہونے کی خبر ملی۔ علامہ شبلی کی پوتی اور حامد نعمانی مرحوم کی اس دنیا میں آخری یادگار محسنہ سلطانہ بھی امریکہ کی خاک کا حصہ بن گئیں۔ رونق محفل کی یہ یادگار بھی باقی نہ رہی۔ ان مرحومین کا حق ہے کہ معارف میں ان کا ذکر وفیات کے صفحات پر کیا جائے۔ آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ یہ فرض ادا کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے مغفرت کا معاملہ فرمائے۔

***

مقالات

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تفسیر کے ادبی محاسن

کلیم صفات اصلاحی، رفیق دارالمصنّفین
kaleemsefatislahi@gmail.com

قرآن مجید رب کائنات کا کلام ہے۔ یہ ہر قسم کے معایب و نقائص سے پاک ہے۔ اس کی زبان عربی ہے۔ ایسی عربی جس کی فصاحت و بلاغت، لطافت و نزاکت، روانی و سلاست، لب ولہجہ، اسلوب بیان وصحت زبان، ایجاز واطناب، استعارات و کنایات، اشارات و محذوفات کا وہ اعلیٰ ترین معیار ہے جہاں تک جن وانس میں سے کسی کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ قرآن مجید کی ٹکسالی زبان عربی زبان کے محاسن کا ایسا کامل نمونہ ہے جس کی جھلک امرء القیس، عمرو بن کلثوم اور قس بن ساعدہ جیسے باکمال شعرا وخطبا کے اشعار وخطبات میں بھی نہیں ملتی ہے۔ قرآن مجید کے ایجاز و اعجاز اور اس کے ادبی محاسن کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے دور جاہلیت کے ادباء و شعرا کے محاسن و معایب کلام کو سمجھنے کا ذوق پیدا کرنا پڑے گا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تلمیذ فراہیؒ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے اندر یہ ذوق، تربیت فراہیؒ اور ان کے خصوصی مطالعے کے نتیجے میں نکھر چکا تھا۔ اس کے نظائر و شواہد ان کی عظیم الشان اردو تفسیر ''تدبر قرآن'' کی ۹ جلدوں میں جابہ جا بکھرے ہیں۔ اسی کا اثر تھا کہ جب انہوں نے اس مہتم بالشان تفسیر کو لکھنے کا ارادہ کیا تو اس بات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا کہ لکھنے کے دوران اس میں اردو زبان و ادب کا وہی بلند ترین پیمانہ و معیار اپنایا جائے جو صحتِ زبان، حسن ادا، لطافت بیان، سلاست، نشتریت، اثر انگیزی، سادگی و پرکاری، استعارات و کنایات اور ایجاز سے آراستہ ہو۔ لغوی تحقیق، محققانہ ژرف نگاہی، نکتہ سنجی اور خوبیِ ترجمہ اس پر مستزاد۔

زیر نظر مقالے میں ''تدبر قرآن'' کے ادبی محاسن کا جائزہ اس کی بعض جلدوں کے حوالے سے لینے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے ایک طرف تو تدبر قرآن کا ادبی پہلو سامنے آئے گا اور دوسری طرف مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحب کے اسلوب نگارش کے اس کمال کا اندازہ ہوگا کہ تفسیر جیسے خشک موضوع میں بھی انہوں نے ادب اعلیٰ کی چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ قارئین کے ذوق ادب کو جلا بھی ملے اور ان کے دل پر آیت قرآنی کے اثرات رفتہ رفتہ مرتب

ہوتے جائیں۔

مولانا اصلاحیؒ کو ابتدا ہی سے ادب سے دلچسپی تھی۔ ایام طالب علمی میں ہی ایک سوال "مستقبل میں کیا بننا چاہتے ہیں؟" کے جواب میں فرمایا کہ "ادیب الہند"[1]۔ اس جملے سے ان کی خواہش و عزم کے ساتھ ساتھ ان کے ابتدائی ذوق و شوق ادب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جس خطہ وماحول میں پرورش پائی وہ علامہ شبلیؒ و فراہیؒ اور اقبال سہیل جیسے مایۂ ناز ادبا و فضلا کی نسبت سے معروف و مشہور تھا۔ ان صاحبان فضل و کمال کی تصنیفات و مقالات کے مطالعے نے ان کے فطری ذوق ادب کو مزید مہمیز کیا اور وہ شستہ و شگفتہ اور معیاری زبان لکھنے کے عادی ہو گئے۔

ان کی تحریروں کی رعنائی، شستگی، سلاست اور اس کے پیچھے کے اسباب اور بعد میں ان کے اپنے جداگانہ رنگ و آہنگ کا ذکر کرتے ہوئے سابق ناظم دارالمصنّفین مولانا ضیاءالدین اصلاحی مرحوم رقم طراز ہیں:

> مولانا امین اصلاحیؒ کی رگ و پے میں علامہ شبلیؒ کی صہبائے علم و ادب رقص کر رہی تھی اور وہ ان کے طرز تحریر کو اردو انشاپردازی کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھتے تھے۔ ان کی تحریروں کی رعنائی، دلکشی اور دلآویزی کا یہی سبب ہے لیکن اب ان کی پختگی اور مشّاقی سے ان کا اپنا الگ اور جداگانہ رنگ و آہنگ بھی ہو گیا تھا۔ جس میں سادگی کے باوجود پرکاری ہوتی تھی۔ طبقۂ علما میں ایسی صاف، شستہ، سلیس، شگفتہ اور رواں اردو لکھنے والے کم ملیں گے۔[2]

مولانائے محترم نے مذکورہ بالا اقتباس میں صاحب "تدبر قرآن" کی تحریروں کی یہ عام خصوصیت بتائی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ رنگ ان تمام مذہبی تصنیفات اور دینی تحریروں، جن میں تبلیغ و ترسیل مدّعا کے لئے ادیبانہ اسلوب اختیار کرنے کی گنجایش کم ہی ہوتی ہے، میں بھی نظر آتا ہے۔ مولانا کو خواہ شرک و توحید کی حقیقت بتانی ہو یا تزکیۂ نفس اور دعوت دین اور اس کے طریقۂ کار کی وضاحت کرنی ہو، ہر جگہ ان کا اشہب قلم ادبی رعنائی و گلکاری کی خوشبو بکھیرتا ہوا محو خرام دکھائی دیتا ہے۔ تدبر قرآن اپنی افادیت، اہمیت، جامعیت کے لحاظ سے

---

[1] علوم القرآن (ششماہی)، "مولانا امین احسن اصلاحی نمبر" ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ، جنوری ۱۹۹۸–دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۴۷۳۔

[2] معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۹۸ء، ص ۶۴۔

تو مقام انفرادیت پر فائز ہے ہی، ساتھ ہی اس کے تقریباً ہر صفحہ میں مولانا اصلاحی کی انشاپردازی، فصاحت وبلاغت اور سلاست و روانی کے نمونے موجود ہیں۔ تشبیہات و استعارات اور ایجاز کا خاص طور پر سہارا لیا ہے۔

ایجاز واختصار کی خوبی: کسی بھی تحریر کی اصل خوبی اس کا ایجاز واختصار ہوتا ہے۔ مختصر جملوں میں بڑے بڑے مطالب ادا کرنا ایک بڑے ادیب وانشاء پرداز کا کمال ہوتا ہے۔ خود قرآن بھی اپنے ایجاز میں بے نظیر ہے۔ اہل علم واقف ہیں کہ قرآن مجید بظاہر ایک مختصر سی کتاب ہے لیکن پچھلے تقریباً ساڑھے چودہ سو برس سے علوم و معارف کے اس بحر بیکراں میں غوطہ زنی اور اس کے الفاظ ومعانی کی تشریح و تفسیر کرکے علم وتحقیق کے نئے نئے لعل و جواہر کی برآمدگی اور نئے نئے موضوعات کی تلاش کا سلسلہ جاری ہے۔ ایسا اس لیے ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب میں ایجاز کلام کو بنیادی اہمیت دی ہے اور اس کے اطناب وتفصیل کو بندوں کے ذمہ کردیا ہے اور حاملینِ قرآن اپنی استطاعت و توفیق کے مطابق اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش کررہے ہیں۔ مولانا اصلاحی قرآن مجید کے اس راز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ اسلوب، تاثیر واثر انگیزی کے اعتبار سے بہت ضروری ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے بھی اپنی اس تفسیر میں ایجاز کو بہت اہمیت دی ہے اور کوشش کی ہے کہ مختصر لفظوں اور جملوں میں قرآن مجید کے زیادہ سے زیادہ معانی و مطالب قارئین تک پہنچا دیے جائیں۔ تدبر قرآن کی اس خوبی کا اندازہ اس کی تقریباً ہر آیت کی تفسیر وتشریح سے کیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش ہیں:

قرآن مجید کی سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۳۴ "و إذ قلنا للملآئكة اسجدوا....الخ" میں آدم کے سامنے فرشتوں کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے۔ مولانا اصلاحی نے اس آیت کی تفسیر میں سجدہ کا مفہوم، اس کے مدارج، گذشتہ مذہبوں میں اس کی حیثیت، اس کی شکل، پھر اسلام میں اس کی حقیقت و مقصدیت کو چند جملوں میں بیان کردیا ہے:

> سجدہ کا لفظ عربی زبان میں جھکنے کے معنی میں آتا ہے۔ جھکنے کے مختلف مدارج ہوسکتے ہیں۔ کسی کے آگے تعظیم کے طور پر سر نہوڑا دینا بھی جھکنا ہے اور پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھ دینا بھی جھکنا ہے۔ پچھلے مذاہب میں تعظیم کی یہ قسم غیر اللہ کے لیے جائز تھی لیکن عموماً اس کی حد وہی تھی جو ہمارے یہاں رکوع کی ہے۔ بنی اسرائیل میں اس طرح کے تعظیمی سجدے کا عام رواج تھا اور تورات کے مختلف مقامات سے جو شکل متعین ہوتی ہے وہ رکوع سے ملتی جلتی ہے۔ اسلام نے تعظیم کی اس شکل کو خدائے ربّ العزت کے لیے خاص کردیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام

خدا کا آخری اور کامل دین ہے۔ اس نے توحید کی حقیقت کو مکمل طور پر اجاگر کر دینے کے لیے تعظیم و تذلل کی شکلیں بھی خاص کر دی ہیں تا کہ اس کے اندر شرک کو داخل ہونے کے لیے کوئی رخنہ نہ رہے۔[۳]

سورہ آل عمران کی آیت ۲۰ میں وارد "الأمّيّين" کے صحیح مفہوم و معنی، بطور لقب یہ لفظ کن قوموں کے لیے پہلے پہل استعمال کیا گیا، عربوں اور آنحضورؐ کے لیے قرآن کے اس لفظ کو استعمال کرنے کی وجہ، تورات میں اس کا ذکر، اس لفظ میں تحقیر کا پہلو وغیرہ جیسے امور کو محض ایک پیراگراف میں بیان کر دیا ہے:

"امی" مدرّسی و کتابی تعلیم و تعلّم سے ناآشنا کو کہتے ہیں۔ "امیین" کا لفظ اسماعیلی عربوں کے لیے بطور لقب استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے ناآشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے اور اس طرح بنی اسرائیل کے بالمقابل، جو حامل کتاب تھے، امیت ان کے لیے ایک امتیازی علامت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ عربوں کے لیے اس کے استعمال کا آغاز اہل کتاب سے ہوا ہو، اس لیے کہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ذریت کی بدویّت و امیت کا ذکر تورات میں بھی ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس لفظ کے استعمال میں عربوں کے لیے کوئی تحقیر کا پہلو نہیں تھا۔ چنانچہ قرآن نے اس لفظ کو عربوں کے لیے ان کو اہل کتاب سے ممیز کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی پہلو سے آنحضورؐ کے لیے "نبی امی" کا لقب استعمال کرتے تھے جو اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ اس میں اپنے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں پاتے تھے، بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے بھی اپنی قوم کے لیے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے مثلاً وہ حدیث جس میں ارشاد ہوا ہے: نحن أمّة أمّيّة (الحدیث)۔ بعض جگہ اگر یہ لفظ تحقیر کے طور پر استعمال ہوا ہے تو وہاں اس کا مفہوم محض لغوی ہے، اصطلاحی نہیں۔ مثلاً "أمّيّون لا يعلمون" (الآیۃ) اس سے مراد یہود کے ان پڑھ عوام ہیں۔[۴]

سجدہ و امیّ کے معنیٰ و مفہوم کے تعین میں نہ جانے کتنے مفسرین نے درجنوں صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں لیکن جو اختصار و ایجاز مولانا کے یہاں نظر آتا ہے وہ دوسروں کے یہاں کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ مولانا نے ان چند جملوں میں ان لفظوں کی حقیقت اور تاریخ تحریر کر دی اور اظہار مدّعا میں کسی قسم کا کہیں جھول یا نقص آنے نہیں دیا اور رطب و یابس اور سطحی باتوں سے صرف نظر کرتے

---

(۳) تدبر قرآن، دار الاشاعت الاسلامیہ، امرت روڈ، کرشن نگر، لاہور - ۱۹۶۷، ج۱، ص۱۱۹۔

(۴) تدبر قرآن، تاج کمپنی، ترکمان گیٹ، دہلی، طبع ۱۹۹۷ء، ج۲، ص۵۳۔

ہوئے صرف ضروری اور مفید باتوں کو ہی رقم کیا ہے۔ اس سے تدبر قرآن کی اس نمایاں خوبی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سادگی، برجستگی و بے ساختگی: تدبر قرآن کے ادبی محاسن کے مطالعے میں یہ بات خاص طور پر دامن دل کو اپنی جانب کھینچتی ہے کہ اس کی عبارتیں تصنّع و بناوٹ سے پاک ہونے کے باوجود بلا کی بے ساختگی کی حامل ہیں۔ مولانا نے آیتوں کی تشریح و وضاحت میں تکلف سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ہر سطر بے ساختہ تحریر کرتے چلے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک لفظ بھی زائد اور بے ضرورت محسوس نہیں ہوتا۔ اس سے یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ مولانا نے انتہائی ہوشیاری اور کمال ہوش مندی سے اس پہلو کو پیش نظر رکھا تھا۔ مولانا نے کہیں اگر کسی لفظ کا مفہوم متعین کیا ہے یا لغوی معنیٰ بتائے ہیں یا آیتوں کی وضاحت کی ہے تو ہر جگہ اس بات کا لحاظ کیا ہے کہ عبارتوں اور جملوں کی سادگی، برجستہ و بے ساختہ پن متاثر و مجروح نہ ہو اور ان کا شکوہ و تجمل بھی باقی رہے اور ساتھ ہی فکری گہرائی و گیرائی بھی متاثر نہ ہو۔ مثال کے طور پر سورہ مؤمنون کی آیت ۷۰ " أم يقولون به جِنّة...الخ " کی تفسیر میں دیکھیں کہ مولانا نے کس قدر سادہ عبارت میں آیت کے معنیٰ و مفہوم کو بیان کیا ہے۔ اس میں ایک لفظ نہ تو زاید محسوس ہوتا ہے اور نہ ہی پر تکلّف و پر تصنّع۔ جملوں کی برجستگی و بے ساختگی بھی قابل دید مگر ان کا شکوہ و تجمّل بھی باقی ہے:

> یعنی اگر وہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ رسول کو خبط اور سودا لاحق ہے تو یہ خود ان کے اپنے پاگل ہونے کی دلیل ہے۔ رسول کو کوئی خبط و سودا نہیں ہے۔ وہ تو جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ بالکل حق ہے اور اس کی ایک ایک بات پوری ہو کر رہے گی۔ البتہ یہ لوگ خود حق سے بیزار ہیں۔ اس وجہ سے رسول کو دیوانہ قرار دے رہے ہیں۔ مریض کو جب طبیب کی تشخیص کردہ دوائیں کڑوی معلوم ہوتی ہیں اور وہ ان کو حلق سے اتارنے پر تیار نہیں ہوتا تو وہ اپنے کو مریض تسلیم کرنے کے بجائے الٹے طبیب ہی کے مشورے کو ہذیان قرار دیتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا تھا۔ یہ اپنے باطل کو چھوڑ کر حق کے کڑوے کسیلے گھونٹ حلق سے اتارنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس وجہ سے رسول کو دیوانہ قرار دیتے تھے کہ اس طرح اپنی خرد باختگی پر کچھ پردہ ڈال سکیں۔ [۵]

تاثیر و دلآویزی اور سلاست و روانی: با مقصد تحریر کے لیے جو چیز سب سے اہم اور ضروری ہے

---

[۵] ماخذ سابق، ج ۵، ص ۳۳۵۔

وہ رواں، دلنشین اور مؤثر جملوں کا لکھنا ہے۔ اگر تحریر میں ثقالت اور روکھا پن ہے، سلاست و روانی نہیں ہے تو وہ اثر پذیری کے بجائے بیزاری و تنفّر کا باعث ہوگی۔ مولانا اصلاحی اس راز سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے تدبر قرآن میں پوری چوکسی کے ساتھ آیتوں کی تفسیر اور عربی عبارتوں کے ترجمے میں اس کا لحاظ کیا ہے اور اپنی طلاقت لسانی، زور بیان اور حسن ادا سے کام لے کر ایسے رواں، سلیس اور مؤثر جملے لکھے ہیں کہ قاری ان کے اسلوب تحریر کا قائل ہوتا جاتا ہے اور اس کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مولانا اصلاحی نے خالص مذہبی تحریروں میں بھی ادبی رنگ و آہنگ، تاثیر و روانی اور چاشنی پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی ہے اور جملوں کو پرکشش اور دلآویز بنانے کا ہنر انہیں بخوبی معلوم ہے۔ مثلاً سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۷۹ "وسخّرنا مع داؤد الجبال یسبّحن والطیر وکنّا فاعلین" کی دلنشین، مؤثر اور سلیس تفسیر ملاحظہ فرمائیں:

> حضرت داؤدؑ کی درویشی کی طرف اشارہ ہے کہ ایک طرف تو ہم نے ان کو تخت حکومت پر بٹھایا تھا۔ وہ پوری بیدار مغزی اور بے نفسی کے ساتھ رعایا کے اندر امن و عدل قائم کرتے تھے۔ دوسری طرف ان کے تعلق باللہ کا یہ حال تھا کہ وہ شب میں پہاڑوں میں نکل جاتے اور ان کی حمد و تسبیح کے نغموں اور گیتوں کی صدائے بازگشت پہاڑوں میں گونجتی اور پرندے بھی ان کی ہم نوائی کرتے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ تورات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت داؤدؑ نہایت خوش الحان تھے اور اس خوش الحانی کے ساتھ ساتھ ان کے اندر سوز و درد بھی تھا۔ مزید برآں یہ کہ ان کی تمام مناجاتیں، گیتوں اور نغموں کی شکل میں ہیں اور یہ گیت الہامی ہیں۔ ان گیتوں کا حال یہ ہے کہ زبور پڑھیے تو اگرچہ ترجمہ میں ان کی شعری روح نکل جاتی ہے لیکن آج بھی ان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل سینے سے نکل پڑے گا۔ حضرت داؤدؑ جیسا خوش الحان اور صاحب سوز و درد جب ان الہامی گیتوں کو پہاڑ کے دامن میں بیٹھ کر سحر کے سہانے وقت میں پڑھتا رہا ہوگا تو یقیناً پہاڑوں سے بھی ان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی ہوگی اور پرندے بھی ان کی ہم نوائی کرتے رہے ہوں گے۔ یہ خیال نہ فرمایئے کہ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، اپنے رب کی تسبیح کرتی ہے لیکن ہم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ ان کا یہ شوق تسبیح اس وقت اور بھڑک اٹھتا ہے جب کوئی صاحب درد ایسا نغمہ چھیڑ دیتا ہے جو ان کے دل کی ترجمانی کرتا ہے اس وقت وہ بھی جھوم اٹھتے ہیں اور اس کی لے میں اپنی لے ملاتے ہیں۔ اگر پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح ہم نہیں سمجھتے سنتے تو یہ خیال نہ کیجیے کہ اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں سنتا سمجھتا۔ وہ لوگ اس کو سنتے اور سمجھتے ہیں جن کے سینوں میں دلِ گداختہ ہوتا ہے۔ مولانا روم نے خوب بات فرمائی ہے:

فلسفی کُو منکر حنّانہ است از حواس انبیا بیگانہ است(۶)

یا مثلاً سورہ نساء کی ایک طویل آیت نمبر ۱۳۵ کا ایک ٹکڑا "إن یکن غنیّا أو فقیرا فاللہ أولیٰ بھما...الخ" کی تفسیر نہایت سلیس اور رواں اسلوب میں کی ہے۔ لکھتے ہیں: "یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ امیر کے لیے اور باٹ سے تولو، غریب کے لیے اور باٹ سے۔ قوی اور باأثر کے لیے الگ قانون و شریعت ہو اور کمزور و بے اثر کے لیے الگ حکم و فتویٰ۔ بلکہ سب کو اللہ کے ایک ہی قانونِ عدل کے تحت ہونا چاہیے اس لیے کہ اللہ کا حق سب پر یکساں قائم ہے اور یہ حق دوسرے تمام حقوق سے بڑا ہے۔ اگر کوئی شخص امیر اور باأثر ہے تو اس وجہ سے وہ شخص بری الذمہ نہیں ہو جاتا کہ وہ خدا کے قانون کی ذمہ داریوں سے بری کر دیا جائے اور اس کے ساتھ کسی اور قانون کے تحت معاملہ کیا جائے"(۷)۔

سورہ توبہ آیت نمبر ۱۰۰ کے ایک ٹکڑے "رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ" کی عظیم بشارت کا تذکرہ کرتے ہوئے "نفس مطمئنہ" کا مطلب کس قدر ادیبانہ، سلیس اور دلنشین اسلوب بیان میں سمجھایا ہے:

> اللہ سے ان کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کو ہر رنگ میں انھوں نے اس کے عدل، اس کی حکمت اور اس کی رحمت پر محمول کیا۔ ان کو اگر کوئی افتاد پیش آئی تو اس کو انھوں نے اپنی کسی خامی کا علاج سمجھا، کوئی مشکل پیش آئی تو اس کو صبر و عزیمت کا امتحان جانا۔ سکھ ملا تو دل و جان سے اس کے شکر گزار ہوئے۔ دکھ ملا تو صابر و مطمئن رہے۔ کسی حال میں بھی اپنی امید کے چراغ کو انھوں نے گل نہیں ہونے دیا۔ طوفان اٹھے۔ بجلیاں چمکیں بلکہ کبھی کبھی برقِ خرمن سوز سارے خرمن کو جلا کر خاکستر بھی کر گئی۔ لیکن ان کے نفس مطمئنہ کو کوئی چیز بھی ہلا نہ سکی۔ وہ بدستور "راضیۃ مرضیۃ" کی چٹان پر جما رہا اور بالآخر اس نے "فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی" کی ابدی بشارت حاصل کی۔(۸)

اوپر یہ بات لکھی گئی ہے کہ مولانا نے عربی عبارتوں کے ترجمے بھی بڑے سلیس و رواں اسلوب میں کیے ہیں۔ اس کے ثبوت کے لیے اسی آیت کے تحت حدیث عائشہؓ کا ترجمہ پیش ہے جس میں عبارت کی سلاست و روانی کا مولانا اصلاحی مرحوم نے خصوصی لحاظ کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

---

(۶) دیکھیے مولانا روم، کلیات مثنوی معنوی مولوی، دفتر اول، مرتد شدن کاتب وحی الخ، کانون انتشارات علمی ۱۳۵۲ھ، ص ۱۸۳۔

(۷) ماخذ سابق، ج ۲، ص ۴۰۶ - ۴۰۷۔

(۸) ماخذ سابق، ج ۳، ص ۶۳۶۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

جب ایک مخزومیہ عورت نے چوری کی تو اس کے معاملے کی قریش کو بڑی فکر ہوئی۔لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کون شخص ایسا ہو سکتا ہے جو رسول اللہؐ سے اس کی سفارش کرے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اس کی جرأت صرف اسامہ بن زیدؓ کر سکتے ہیں۔وہ رسول اللہؐ کے بڑے چہیتے ہیں۔لوگوں کے کہنے پر اسامہؓ نے حضورؐ سے اس کی سفارش کی۔ حضورؐ نے فرمایا: اسامہ تم اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود میں سے ایک حد کے معاملے میں سفارش کرنے آئے ہو؟ پھر آپؐ خطبے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: لوگو! تم سے پہلے قوموں کو اسی چیز نے تباہ کیا کہ ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ اگر ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔خدا کی قسم میں ایسا نہیں کرنے کا۔ میں تو اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔[9]

یا عربی اشعار کے اردو ترجموں کو دیکھیں کہ مولانا نے ان میں سلاست وروانی اور ترجمے کی فنّی خوبی کا کس قدر لحاظ کیا۔ترجمے کے لیے لفظوں کے انتخاب میں اس جانب خاص طور پر توجہ کی ہے کہ اشعار عربی زبان میں جس مفہوم کے حامل ہیں وہی معنی اردو میں بھی سمجھے جائیں۔اگر لفظوں کی حرارت یا اس کے مزاج کو سمجھنے کی صحیح لیاقت وصلاحیت نہیں ہے تو ترجمانی بھی غلط ہو گی۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا اصلاحی عربی زبان کے مزاج شناس تھے۔بالخصوص عہد جاہلیت کے اہم اور مستند شعری سرمایہ پر ان کو دستگاہ حاصل تھی۔اس کا اندازہ عربی اشعار کے اردو ترجمہ سے ہوتا ہے۔ذیل میں عربی اشعار مع اردو ترجمہ مثالاً پیش کیے جاتے ہیں تاکہ قارئین کے سامنے ان کے کیے ہوئے ترجمہ کی خوبی ظاہر ہو جائے۔مولانا اصلاحی نے جہاں بعض لفظوں کی لغوی تحقیق کی ہے وہاں خاص طور پر عربی کے اشعار مع ترجمہ نقل کئے ہیں۔آئندہ سطور میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔یہاں ان کے علاوہ دوسرے عربی اشعار مع سلیس ورواں ترجمے کے نقل کیے جاتے ہیں۔

سورہ بقرہ کی آیت ۴۹ "و إذ نجّيناكم من آل فرعون...الخ" میں آل کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "آل فرعون یعنی قوم فرعون۔ آل سے مراد صرف کسی شخص کی اولاد نہیں ہوا کرتی بلکہ یہ لفظ آل واولاد، قوم وقبیلہ اور اتباع وانصار سب پر حاوی ہے"۔

نابغہ ذبیانی کا شعر ہے:

---

[9] ماخذ سابق، ج ۲، ص ۴۰۷۔

من آل میہ رایح أو مغتدی عجل فذا زاد و غیر مزود

ترجمہ: میہ کے قبیلہ کے لوگوں میں کوئی صبح روانہ ہوا کوئی شام، کوئی زادراہ کے ساتھ، کوئی بغیر زادراہ کے[۱۰]

مولانا اصلاحی نے لکھا ہے کہ انہوں نے یہ تحقیق مولانا فراہی کی مفردات القرآن سے اخذ کی ہے۔ناظرین جانتے ہیں کہ مفردات القرآن عربی زبان میں ہے۔ مولانا نے اس پوری عبارت اور اس میں موجود شعر کا ترجمہ کس قدر سلیس ورواں اسلوب میں کیا ہے۔

سورہ انفال کی آیت نمبر ۴۳ "إذ يريكهم الله في منامك قليلاً...الخ" کے تحت لفظ قلیل پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہاں یہ بات بھی نگاہ میں رکھنی چاہیے کہ قرآن نے "قلیل" کا لفظ جنچا تلا استعمال کیا ہے۔ عربی لفظ "قلیل" صرف عددی اور مقداری اعتبار ہی سے قلیل کے لیے نہیں آتا بلکہ معنوی اعتبار سے بےوزن و بے حقیقت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کسی حماسی کا یہ شعر بہت معروف ہے:

فان أك في شرار كم قليلا فإني في خياركم كثيرا

ترجمہ: اگر میں تمہارے اشرار کی نگاہ میں کم رتبہ ہوں تو کچھ غم نہیں۔ تمہارے اخیار کی نگاہوں میں میرا بڑا رتبہ ہے[۱۱]۔

تشبیہات واستعارات وکنایات: اپنی بات لوگوں تک پہنچانے، ترسیل و تبلیغ مدعا یا تفہیم مطلب کے لیے تشبیہات و استعارات اور کنایات کا استعمال کیا جاتا ہے تا کہ اس خاص پیرایۂ بیان میں سامنے والے کو بات بہ آسانی سمجھ میں آجائے۔ اس خالص ادبی اسلوب کو وہی برت سکتا ہے جس کا ذوق ادیبانہ ہو، جس کو ادبی اصطلاحوں کا علم ہو، جس کی گرفت زبان و بیان پر مضبوط ہو۔ مولانا اصلاحی نے اپنی تفسیر میں تاثیر کا رنگ بھرنے کے لیے استعارات و کنایات اور تشبیہات و تمثیلات کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ اس سے ایک طرف تفسیر و تشریح آیات میں لطف و اثر بڑھ گیا اور دوسری طرف قرآن کے علمی و ادبی و قار و متانت کا قاری کے دل میں جو مقام ہے اس میں اضافہ

---

[۱۰] ماخذ سابق، ج۱، ص۱۶۶۔ ابو عبد اللہ محمد بن مرزبانی کی الموشح في مآخذ العلما على الشعراء میں آل سے پہلے "من" کے بجائے "أمن" اور "عجل" کے بجائے "عجلان" لکھا ہوا ہے۔ دیکھیے جمعیۃ نشر الکتب العربیۃ، قاھرہ ۱۳۴۳ھ، ص۳۸۔

[۱۱] ماخذ سابق، ج۳، ص۴۵۵۔ مرزوقی کے مطابق یہ عباس بن مرداس کا شعر ہے۔ دیکھیے شرح دیوان حماسہ، ابو علی احمد بن محمد بن حسن مرزوقی، محقق غرید الشیخ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان ۲۰۰۳ء، ص ۸۱۲۔

بھی ہو گیا ہے۔ درج ذیل چند مثالیں اس دعویٰ کے تائیدی دلائل فراہم کرتی ہیں۔

تدبر قرآن کا مطالعہ کرنے والے اس سے بخوبی واقف ہیں کہ مولانا اصلاحی نے قرآن مجید کے الفاظ کی لغوی و اصطلاحی تعریف و تحقیق پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے ان کا مقصد آیتوں کے اندر تہ در تہ معانی و مفاہیم اور اس کے اصل مطلوب و حقیقت تک پہنچنا ہے۔ مولانا نے ان لفظوں کی تحقیق و تبیین میں جو اسلوب اختیار کیا ہے اس میں استعارہ و کنایہ اور تمثیل و تشبیہ کو خاص وسیلہ بنایا ہے۔ آئندہ سطور میں دیکھیں کہ مولانا نے سورہ انعام کی آیت ۷۵ "وكذلك نرى إبراهيم ملكوت السمٰوٰت والأرض وليكون من المؤمنين" میں وارد لفظ "ملکوت" کی تحقیق میں کس قدر سر مغزنی کی ہے اور اس کی کنہ و حقیقت کو قارئین تک پہنچانے کے لیے تمثیل و تشبیہ کے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں؟۔ ان کے مطابق ملکوت کا لغوی مفہوم تو عزت و وقار ہے لیکن یہ لفظ قرآن میں خدا کی تکوینی بادشاہت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کا یہ بھی کہنا ہے کہ ملکوت الٰہی یا نظام کائنات پر غور و فکر کرنا تمام علوم کی کلید ہے۔ لکھتے ہیں:

جہاں تک غور کرنے کا تعلق ہے اس ملکوت پر غور ایک سائنس داں بھی کرتا ہے لیکن وہ سارا غور و فکر اپنی ذات یا اپنے محدود ماحول کو محور بنا کر کرتا ہے۔ اس کی نگاہ صرف اپنے نفع عاجل پر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ ان حقائق تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا جو اس کی نگاہ کو اس مطلوب نفع عاجل سے ہٹا دیں۔ وہ چمن میں کھلے ہوئے گلاب کو اس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اس سے گل قند یا اسی طرح کی کوئی اور چیز تیار ہو سکتی ہے جس سے فلاں فلاں فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس چکر میں نہیں پڑتا کہ اس پھول کے حسن و جمال، اس کی رعنائی و دلکشی، اس کی عطر بیزی و مشام نوازی میں اس کے صانع کی قدرت، کاریگری، حکمت، رحمت اور ربوبیت کے جلوے دیکھنے کی کوشش کرے اور ان جلوؤں سے بے خود ہو کر پھول سے گزر کر پھول کے پیدا کرنے والے کے جمال و کمال کے مشاہدے میں غرق ہو جائے:

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

حالانکہ ایک صاحب نظر کے لیے پھول کا یہی پہلو زیادہ جاذب نظر ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر پھول سے مقصود صرف گل قند ہی ہوتا تو صرف اس مقصد کے لیے اس کی ایک ایک پنکھڑی پر قدرت کو اس فیاضی کے ساتھ گل کاری کی کیا ضرورت تھی۔ یہ گل کاری اور صنعت گری تو اس لیے فرمائی گئی ہے کہ پھول کی ایک ایک پتی معرفت کردگار کے کام آئے۔

نیوٹن نے سیب کے درخت سے ایک سیب زمین پر گرتے دیکھا۔ اس سے اس کا ذہن زمین کی کشش کے اصول کی طرف منتقل ہو گیا۔ پھر اس اصول سے بہت سے اصول دریافت ہو گئے جو

علمی تحقیقات و انکشافات میں بہت کار آمد ثابت ہوئے۔ لیکن نگاہ ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس اصول کی تمام کار فرمائیاں بس اسی دنیا کی تنگ نائے کے اندر تک محدود رہ گئیں۔ ورنہ یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے کائنات کی ایک چیز خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، جذب و کشش کے قانون سے باندھ رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا ایماندارانہ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ "ذٰلك تقدير العزيز العليم" یہ سارا کارخانہ ایک غالب و مقتدر اور ایک حکیم و علیم کا بنایا ہوا ہے لیکن اس سوال اور اس کے جواب سے چونکہ بہت بھاری ذمہ داریاں انسان پر عاید ہوتی ہیں اس وجہ سے ہمارے سائنسداں اس سے بھاگتے ہیں۔ [۱۲]

حالانکہ یہ ایک خالص فلسفیانہ اور فکری بحث و تحقیق ہے لیکن مولانا نے اس بحث میں تشبیہ و تمثیل کا رنگ بھر کے اس کو ادبی اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۲۷ "يا بنى آدم لايفتننكم الشيطٰن كما أخرج أبويكم من الجنة...الخ" کے تحت مولانا نے تمدن میں فساد پیدا کرنے کے لیے شیطان کی ایک خاص چال کو جس انداز سے سمجھانے کی کوشش کی ہے اس سے جہاں ایک طرف آیت کے اندر پائے جانے والے معانی و مفاہیم اور اس کے اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف عبارتوں میں تشبیہ و تمثیل اور استعارے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ قارئین ملاحظہ فرمائیں کہ مولانا نے انسانوں کے اعلیٰ معاشرے کا کیسا واضح نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے:

> یہ ان ہی یاددہانیوں میں سے ہے جو ابتدا ہی میں اولاد آدمؑ کو کی گئی تھیں اور اس کے اسلوب بیان سے شیطان کی اس چال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو وہ بنی آدم کے تمدن کو برباد کرنے اور بالآخر ان کو خدا کی نعمت سے محروم کر کے ہلاکت کے گڑھے میں گرانے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے پہلے لوگوں کو اس لباس تقویٰ سے محروم کرتا ہے جو اللہ نے بنی آدم کے لیے اس ظاہری لباس کے ساتھ ایک تشریف باطنی کی حیثیت سے اتارا ہے...... جب یہ باطنی جامہ اتر جاتا ہے تو وہ حیا ختم ہو جاتی ہے جو اس ظاہری لباس کی اصل محرک ہے۔ پھر یہ ظاہری لباس ایک بوجھ معلوم ہونے لگتا ہے۔ بے حیائی، صنفی اعضا میں جن کا چھپانا تقاضائے فطرت ہے، عریاں ہونے کے لیے تڑپ پیدا کرتی ہے۔ پھر فیشن اس کو سہارا دیتا ہے اور وہ لباس کی تراش خراش میں نت نئے اختراعات سے ایسے ایسے اسلوب پیدا کرتا ہے کہ آدم کے بیٹے اور حوّا کی بیٹیاں پہن کر بھی، لباس کے بنیادی مقصد یعنی ستر پوشی کے اعتبار سے، گویا ننگے ہی رہتے ہیں۔ پھر لباس میں صرف زینت و آرائش کا پہلو باقی رہ جاتا ہے اور اس میں بھی

---

[۱۲] ماخذ سابق، ص ۹۰ -۹۱۔

اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ بے حیائی زیادہ سے زیادہ دلکش زاویے سے نمایاں ہو۔ پھر آہستہ آہستہ عقل اس طرف سے ماؤف ہو جاتی ہے کہ عریانی تہذیب کا نام پاتی ہے اور ساتر لباس وحشت اور دقیانوسیت کا۔ پھر پڑھے لکھے شیاطین اٹھتے ہیں اور تاریخ کی روشنی میں یہ فلسفہ پیدا کرتے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت تو عریانی ہی ہے۔ لباس تو اس نے رسوم ورواج کی پابندیوں کے تحت اختیار کیا ہے۔ یہ مرحلہ ہے جب دیدوں کا پانی مر جاتا ہے اور پورا تمدن شہوانیت کے زہر سے مسموم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بے حیا معاشرہ سزاوار ہوتا ہے کہ قدرت اس کے وجود سے زمین کو پاک کر کے ان کی جگہ دوسروں کو لائے اور دیکھے کہ وہ کیسا عمل کرتے ہیں؟۔[۱۳]

آگے شیطان کے بے شمار بھیس اور چرتر کی جانب اشارے کا یہ فصیح و بلیغ انداز دیکھیے کہ آیت کی کیسی تفسیر و توضیح کی ہے اور تشبیہ و استعارہ سے پر جملوں کے ذریعہ ادب اعلیٰ اور معیاری نثر کا نمونہ پیش کیا ہے:

یہ شیطان اور اس کے جتھے کی چالاکی، کیاوی اور فتنہ سامانی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے حملے کے راستے اور ان کے ظہور کے بھیس اتنے بے شمار ہیں کہ تم ان سارے راستوں پر نہ پہرہ بٹھا سکتے، نہ ہر بھیس میں ان کو پہچان ہی سکتے۔ اس کے لشکر میں جن بھی ہیں اور انسان بھی۔ وہ وہاں سے گھات لگائیں گے جہاں سے تم دیکھ نہیں سکو گے اور تمہارے لیے وہ بہروپ بھریں گے کہ تم پہچان نہ سکو گے۔ تم انہیں دوست، ناصح، خیر سگال، مرشد، لیڈر اور نہ جانے کیا کیا سمجھو گے اور وہ تمہارے دین و ایمان کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں گے۔ تم گمان کرو گے کہ وہ تمہارے لیے ترقی کی راہیں کھول رہے ہیں لیکن وہ تم کو وہاں لے جا کر ماریں گے جہاں پانی بھی نہ پاؤ گے۔ ان کو تمہارے باطن کی ساری کمزور رگیں معلوم ہوں گی اور وہ اپنی اندرونی وسوسہ اندازیوں سے بھی تم کو شکار کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنی ظاہری عشوہ گریوں سے بھی تم پر اپنے جال پھینکیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دشمن کو معمولی دشمن نہ سمجھنا، ہر وقت اس سے چوکنّے رہنا۔[۱۴]

اسالیب قرآن پر مولانا اصلاحی کی خصوصی توجہ: قرآن مجید کے اسلوب بیان کی انفرادیت کے تمام اہل علم و تفسیر قائل ہیں لیکن دوران تفسیر اس کے اسلوب پر گفتگو یا اس کی معنویت و افادیت کے پہلوؤں کی تلاش پر توجہ بہت کم ہی لوگوں نے دی ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ انتہائی پتہ ماری، محنت، دقتِ نظری اور مسلسل غور و فکر کا کام ہے۔ قرآن کی ہر آیت بلکہ لفظ لفظ پر مولانا اصلاحی

---

[۱۳] ماخذ سابق، ص ۲۴۶ - ۲۴۷۔

[۱۴] ماخذ سابق، ص ۲۴۷۔

نے پوری دیانت داری سے غور کیا تھا۔ اسی وجہ سے مولانا کے دل پر قرآن مجید کے متعدد اسالیب منکشف ہوئے اور مولانا نے ان اسالیب کی روشنی میں آیتوں کی تفسیر کی اور ایسے مطالب تک ان کی رسائی ہوئی جہاں تک عام مفسرین نہ پہنچ سکے۔ یہ تدبر قرآن کے ادبی محاسن کا ایک خاص پہلو ہے جس سے اگر پہلو تہی کی جائے گی تو گفتگو نامکمل رہے گی۔ جہاں تک اس خاص موضوع پر تحقیق کی بات ہے تو اس سے قبل پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے تدبر قرآن کی روشنی میں اسالیب قرآن کا جائزہ لیا ہے اور اس حیثیت سے اس پر گفتگو کی ہے۔ اپنے مقالہ میں انہوں نے حذف، التفات، مجانست، سوالیہ اسلوب، مبالغہ فی النفی، نفی الشیء بنفی لازمہ، جملہ معترضہ، گریز، طنز و تعریض، تمثیل و تشبیہ، اسم و فعل کے مواقع استعمال، ضمیروں کا استعمال، بعض الفاظ و حروف کے مواقع استعمال، حروف زائدہ وغیرہ پر مجملاً گفتگو کی ہے اور ہر اسلوب کی مثالیں بھی تدبر قرآن سے دی ہیں۔[۱۵] یہاں مولانا کے بعض ان اسالیب کی نشاندہی کی جائے گی جن پر گفتگو پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی سے رہ گئی۔

پروفیسر قاسمی صاحب نے اپنے مضمون میں ضمیروں کے مرجع کے تعین کے سلسلے میں لکھا ہے کہ مولانا اصلاحی نے ضمیروں کے مراجع کے تعین میں فکر واجتہاد سے کام لیا ہے[۱۶]۔ لیکن اس کے علاوہ ضمیروں کے متعلق ہی مولانا اصلاحی نے ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ قرآن نے جمع کے لیے ضمیر واحد کا استعمال کیا ہے اور اس اسلوب کے فائدے کی نشاندہی بھی کی ہے۔ سورہ انعام کی آیت ۹۹ کے ایک ٹکڑا "انظروا إلى ثمره إذا أثمر وينعه" کے تحت لکھتے ہیں:

> ضمیر کا مرجع ہیں تو وہ ساری ہی چیزیں جن کا اوپر ذکر گذرا لیکن ضمیر واحد اس وجہ سے ہے کہ متکلم چاہتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لے کر ان کے پیدا ہونے سے لے کر ان کے پکنے تک کے تمام مراحل پر غور کیا جائے۔ غور و فکر کا عمل فطری طور پر یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی چیز پر نگاہ جمائی جائے تاکہ قوت فکر منتشر نہ ہو۔ گویا یہاں قرآن نے صرف غور و فکر کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ اس کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ اس اسلوب کی مثالیں قرآن میں بھی ہیں اور کلام عرب میں بھی۔[۱۷]

قسم سے پہلے "لا" کے استعمال کا اسلوب قرآن میں متعدد جگہوں پر آیا ہے لیکن اردو زبان

---

[۱۵] خواہش مند اہل علم علوم القرآن "مولانا امین احسن اصلاحی نمبر" میں اس طویل مقالہ کو دیکھ سکتے ہیں۔

[۱۶] علوم القرآن م "مولانا امین احسن اصلاحی نمبر"، ص ۲۱۱۔

[۱۷] تدبر قرآن، ج ۳، ص ۱۲۶ - ۱۲۷۔

کے کم ہی مفسرین نے اس اسلوب کی معنویت وافادیت کی تلاش کی ہے۔ مولانا اصلاحی نے تدبر قرآن میں اس اسلوب کی وضاحت متعدد مقامات پر کی ہے۔ سورہ قیامہ آیت نمبر ۱ "لا أقسم بیوم القیامۃ" کے تحت اس اسلوب کے متعلق تفصیل سے لکھتے ہیں:

> عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے کہ قسم سے پہلے جب اس طرح "لا" آیا کرتا ہے جس طرح یہاں ہے تو وہ قسم کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے اس خیال کی نفی کے لیے آتا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہوتی ہے۔ اس کی مثالیں جس طرح عربی زبان میں بہ کثرت موجود ہیں ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔ آپ جس کسی کی بات کی فوری تردید کرنی چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: نہیں، خدا کی قسم اصل حقیقت یوں ہے۔ اس اسلوب قسم سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ متکلم کے نزدیک مخاطب کی بات اتنی لغو ہے کہ وہ اس کی تردید میں اتنے توقف کا بھی روادار نہیں کہ قسم کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ اس سے پہلے ہی اس کی تردید بلکہ اپنی بیزاری کا اظہار ضروری سمجھتا ہے۔ بعض لوگوں نے لا کو زائد اور بعضوں نے اس کو فعل سے متصل مانا ہے لیکن یہ دونوں رائیں عربیت کے خلاف ہیں۔ ہم نے جگہ جگہ اس کتاب میں اس کی تردید کی ہے[۱۸]۔

اجمال کے بعد تفصیل بھی قرآن مجید کا ایک معروف اسلوب ہے۔ قرآن میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مولانا اصلاحی نے "تدبر" میں اس اسلوب کی بھی نشاندہی کی ہے اور دوران تفسیر اس کے فوائد تحریر کیے ہیں۔ مثال کے طور پر سورہ قریش کی آیت "لإیلاف قریش، إیلافھم رحلۃ الشتاء والصیف" کے تحت لکھتے ہیں:

> یہ سابق "ایلاف" سے بدل ہے۔ پہلے بات مجمل طور پر کہہ کر ناتمام چھوڑ دی ہے تاکہ سننے والوں میں سوال پیدا ہو جائے کہ قریش کی کون سی وابستگی، کس پہلو سے زیر بحث ہے؟۔ یہ اسلوب کلام قرآن میں بعض دوسرے مقامات میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب بات کو سننے کے لیے بیدار ہو جاتا ہو اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی نوعیت اجمال کے بعد گویا تفصیل کی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے[۱۹]۔

عربیت کے ایک بلیغ اسلوب خبریہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سورۂ فرقان کی آیت نمبر ۲۰

---

[۱۸] ماخذ سابق، ج۹، ص۸۷۔

[۱۹] ماخذ سابق، ص ۵۷۲ - ۵۷۳۔

کا ایک ٹکڑا "أتصبرون" کے تحت رقمطراز ہیں:

"أتصبرون" یہ مسلمانوں کو خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ وہ تو اپنے شکر کے امتحان میں بالکل ناکام رہے۔ اب تم بتاؤ کہ تم ان کے استہزاء اور ان کی مخالفت وعداوت کے مقابل میں ثابت قدم رہنے والے بنتے ہو یا نہیں۔ عربیت کا ذوق رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جب امر کے اندر ترغیب و تشویق اور حث و تحریض کا مفہوم پیدا کرنا ہو تو وہ خبر یہ اسلوب کے قالب میں آتا ہے اور اگر اس پر استفہام آجائے تو اس کے اندر مزید زور پیدا ہو جاتا ہے۔.... یہاں مسلمانوں کو اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ اگر تمہارے مخالفین اپنے امتحان میں ناکام رہے تو ان کو ان کی قسمت کے حوالے کرو، تمہارے صبر و امتحان کا جو مرحلہ ہے اس میں کامیابی کے لیے عزم وحوصلہ کے ساتھ آگے بڑھو۔[20]

یہ اور اس طرح کے درجنوں مقامات ہیں جہاں مولانا اصلاحی نے دوران تفسیر آیتوں کے اندر موجود اسالیب کی نشاندہی کی ہے۔ یہاں بخوف طوالت چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تدبر قرآن میں اسالیبِ قرآن سے جابہ جا تعرّض اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا اصلاحی نے اسالیب قرآن پر غور و تدبر کی جو روش اختیار کی اس کے پیچھے ان کے ادیبانہ ذوق اور انشاپردازانہ مزاج کے ساتھ ساتھ ان کے استاذ مولانا فراہیؒ کی تعلیمی، علمی اور ادبی تربیت کا کمال ہے۔

لفظوں کی تشریح و تفسیر میں اختصار کا پہلو: تدبر قرآن کے ادبی حسن میں یہ چیز اضافہ کا باعث ہے کہ انہوں نے آیات قرآنیہ میں وارد الفاظ کی تحقیق و تدقیق اور اس کے مطالب و معانی کی تشریح و وضاحت میں اختصار سے کام لیا ہے۔ لغاتِ عرب اور کلامِ عرب سے استشہادات و نظائر کو بہت حوالوں کے ساتھ لکھنے کا اہتمام نہیں کیا ہے۔ اس سے تدبر قرآن کی بے جا ضخامت سے بچ گئے ہیں۔ تاہم بعض اہم نحوی و ادبی اشکالات کے حوالے نقل کیے ہیں۔ تشریح و تفسیر میں اختصار وایجاز سے کام لینا ایک مصنف و مفسر کی زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت کے بغیر ممکن نہیں۔ مولانا اصلاحی نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اس ادبی نہج کی وضاحت صاف طور پر کی ہے۔[21] ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر سورہ بقرہ کی آیت ۲۹ میں اس ٹکڑا "ثم استوی فسوّاھن سبع سمٰوات" میں

---

[20] ماخذ سابق، ج ۵، ص ۴۵۸۔

[21] دیکھیے، ج ا مقدمہ، ص (ع/۱)۔

دیکھیں کہ استواء، تسویہ اور سماء کے لغوی معنی و مفہوم کو کس قدر مختصر انداز میں واضح کر دیا ہے:

استواء کے معنی سیدھے کھڑے ہونے کے ہیں...... مقصود یہ بتانا ہے کہ زمین کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمان کو بنایا۔ محض تصویر حال کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں کھڑے ہونے یا متوجہ ہونے کا وہ مفہوم رہنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ جل شانہ کے شایانِ شان ہے۔

تسویہ کے معنی کسی شے کو برابر کرنے اور اعتدال و توازن کے ساتھ قائم کر دینے کے ہیں۔ اس سقف نیلگوں کو جس حد تک ہماری نگاہیں دیکھ سکتی ہیں خواہ مجرّد حالت میں یا سائنس کے ایجاد کیے ہوئے اسلحے سے مسلّح ہو کر، اس کے اندر کوئی رخنہ تلاش کر سکیں۔

سماء کا لفظ سما یسمو سے ہے جس کے معنیٰ بلندی کے ہیں۔ یہ شامیانہ جو ہمارے اوپر تنا ہوا نظر آتا ہے قرآن اس کے عجائب اور اس کی نیرنگیوں کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے اور ان سے جن واضح نتائج کی طرف رہبری ہوتی ہے ان کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے[۲۲]۔

سورۂ بقرہ آیت نمبر ۴۸ "واتّقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا ولا یقبل منها شفاعة ولا یؤخذ منها عدل ولاهم ینصرون" میں جزا، شفاعت اور عدل کے معنیٰ و مفہوم کی مختصر تحقیق ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ مولانا نے ان لفظوں کے معنیٰ قرآنی روح سے کس قدر قریب تر بتائے ہیں۔ ظاہر ہے مولانا نے ان معانی تک پہنچنے کے لیے نحو و لغت اور کلام عرب کا مطالعہ کیا ہو گا لیکن ان میں سے کسی کتاب کا حوالہ اس لیے نہیں دیا کہ کتاب ثقیل وضخیم ہو جائے گی۔ مولانا نے ان معانی کی تفہیم کے لیے ادق الفاظ کا سہارا بھی نہیں لیا ہے بلکہ سادہ اور آسان لفظوں میں ان لفظوں کے معانی بیان کر دیے ہیں۔

جزی عنہ کے معنیٰ ہیں: اس کی طرف سے ادا کر دیا یا اس کی طرف سے کافی ہو گیا۔ "لا تجزی نفس عن نفس شیئا" کے معنیٰ ہوں گے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہ آسکے گا۔ جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہو گی کوئی دوسرا اس کی طرف سے وہ ادا نہ کر سکے گا۔

اس کے بعد اس معنیٰ کی وضاحت کے لیے متعدد آیتیں پیش کی ہیں:

شفاعت، شفع سے ہے۔ شفع الشیء کے معنیٰ ہیں اس کے ساتھ اسی طرح کی چیز ملا کر اس کو جوڑا کر دیا۔ شفع لفلان یا شفع فیه کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کی بات یا درخواست کے ساتھ کوئی شخص اپنی تائید یا سفارش ملا کر اس کو مؤیّد کر دے۔

عدل کے معنیٰ انصاف کے ہیں۔ فرمایا: أن تحکموا بالعدل (یہ کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو)۔

---

[۲۲] ماخذ سابق، ص ۱۰۰-۱۰۱۔

پھر یہیں سے یہ لفظ مساوی اور برابر کے معنیٰ میں استعمال ہوا...... نیز فدیہ کے معنیٰ میں استعمال ہوا کیونکہ فدیہ جس کا فدیہ ہوتا ہے اس کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ (۲۳)

لفظ "برّ" کے معنیٰ و مفہوم کی تفسیر و توضیح دیکھیں کہ یہ لفظ کتنے معانی و مفاہیم کا حامل ہے:

"برّ" کا لفظ عربی زبان میں ایفائے عہد، وفاداری اور ادائے حق کے معنیٰ میں آتا ہے۔ حقوق میں ہر قسم کے حقوق شامل ہیں، بنیادی اور حقیقی۔ مثلاً خدا کی فرماں برداری، والدین کی اطاعت اور خلق کے ساتھ ہمدردی۔ پھر آگے چل کر اس میں وہ حقوق بھی شامل ہو جاتے ہیں جو قول و قرار اور معاہدہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لفظ احسان اور نیکی کی تمام قسموں پر حاوی ہے اور عدل کا بھی ہم معنیٰ ہے۔ اپنے استعمالات کے لحاظ سے یہ لفظ اثم (حق تلفی)، عقوق (والدین کی نافرمانی)، غدر (بے وفائی) اور ظلم کا ضد ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید کی مختلف آیتوں سے ان معانی کا استشہاد کیا ہے:

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ "برّ" کا لفظ ایک پہلو سے نیکی اور بھلائی کے تمام کاموں پر مشتمل ہے لیکن اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے یہ حقوق اور فرائض کے ایفا کے لیے آتا ہے۔ (۲۴)

عربی، فارسی اور اردو اشعار کا استعمال: اظہار مطلب، تفہیم مدّعا اور اپنے خیالات و احساسات کی ترجمانی کے لیے اشعار کا استعمال علماء و مصنّفین بالخصوص ادباء کے یہاں رائج ہے۔ اس سے ایک طرف بات میں زور و اثر پیدا ہوتا ہے دوسری طرف ادیبوں کے ذوق ادب کی سمت کا پتہ چلتا ہے۔ تدبر قرآن میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ مولانا اصلاحی نے اپنے خیالات و تصورات اور بیانات کی تاکید و تایید کے لیے عربی، فارسی اور اردو کے اشعار کا سہارا لیا ہے۔ ان اشعار کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ مولانا اصلاحی کی شعر فہمی کا ذوق اعلیٰ پایہ کا تھا۔ انہوں نے تدبر میں جہاں بھی کسی شعر یا مصرعے کو نقل کیا ہے وہ نہایت برجستہ و برموقع اور بلند پایہ شعرا کے اشعار ہیں۔ ان کے نقل کردہ اشعار فنّی لحاظ سے نقص و سقم سے پاک ہیں۔ افادیت و معنویت میں بھی وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ بالخصوص عربی و فارسی شعرا کے اشعار میں بلا کی سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ اردو شعرا کا کلام بھی معیاری ہے۔ ذیل میں ان تینوں زبانوں پر مشتمل اشعار کی

---

(۲۳) ماخذ سابق، ص ۱۶۵۔

(۲۴) ماخذ سابق، ص ۱۴۳-۱۴۴۔

مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

سورۂ بقرہ کی آیت ۴۶ "الذین یظنّون أنّھم ملقوا ربھم...الخ" میں لفظ ظنّ کے معنی و مفہوم کی وضاحت کے لیے طرفہ اور اوس بن حجر کے اشعار مع ترجمہ بطور استشہاد پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

آدمی کسی چیز کے متعلق اس کے دیکھے بغیر جو رائے قائم کرتا ہے اس کو ظن کہتے ہیں۔ اس طرح کی رائے پر بالعموم چونکہ یقین نہیں ہوا کرتا اس وجہ سے ظن کا لفظ کچھ شک کے ہم معنی سا بن گیا ہے چنانچہ عربی زبان اور قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں بہت استعمال ہوا ہے۔ طرفہ کا مشہور شعر ہے:

وأعلم علما لیس بالظن إنہ　　　إذا ذلّ مولی المرء فھو ذلیل

ترجمہ: میں ایک بات جانتا ہوں جو محض گمان نہیں ہے جبکہ آدمی کا چچازاد بھائی ذلیل ہو جائے تو وہ خود بھی ذلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

لیکن ایک بن دیکھی چیز کے متعلق جو رائے قائم کی جاتی ہے ضروری نہیں کی وہ مشکوک ہی ہو۔ بسا اوقات یہ رائے یقین پر مبنی ہوتی ہے لیکن ظنّ کا لفظ اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ ظن کا یہ استعمال اس کے عام معنی کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اس میں شک کا مفہوم مضمر نہیں ہوتا۔ اوس بن کا حجر کا ایک شعر ہے:

الألمعیّ الذی یظنّ بک الظنّ　　　کأن قد رأی وقد سمعا

ترجمہ: وہ ذہین کہ اگر تمہارے بارے میں کوئی بھی گمان کرے تو معلوم ہوتا ہے دیکھ کر اور سن کر کرتا ہے۔

درید بن صمہ کہتا ہے:

فقلت لھم ظنّوا بألفی مدجّج　　　سراتھم فی الفارسیّ المسرّد

ترجمہ: میں نے ان سے کہا کہ دو ہزار سلاح پوش سواروں کا یقین کرو جن کے سردار باریک کڑیوں کی زرہیں پہنے ہوں گے[۲۵]۔

آگے مولانا اصلاحی نے ان شواہد سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ لفظ اندیشہ اور گمان غالب سے لے کر یقین اور قطعیت کے لیے کافی ہے۔ مولانا اصلاحی نے زیادہ تر شعرا کے اشعار کسی لفظ کے معنی کے تعیّن کے لئے بطور استشہاد پیش کیے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد ظاہر ہے اس زبان میں اس لفظ کے اصلی معنی و مفہوم تک رسائی ہے۔ سجدہ کے اصلی معنی سر جھکانے کے

---

[۲۵] ماخذ سابق، ص ۱۵۱۔

ہیں۔اس کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں لیکن اس کی کامل شکل پیشانی کو زمین پر رکھ دینا ہے اور مولانا اصلاحی نے اس معنی کے تعین کے لیے عمرو بن کلثوم کا یہ شعر نقل کیا ہے:

إذا بلغ الفطام لنا صبیّ تخرّ له الجبابر ساجدینا

ترجمہ:جب ہماری قوم کا کوئی بچہ دودھ چھوڑنے کی مدت کو پہنچ جاتا ہے
توبڑے بڑے جبار اس کے آگے سجدوں میں گر پڑتے ہیں۔[۲۶]

اسی طرح "صفح" کے معنی چشم پوشی اور نظر انداز کرنے کے ہیں۔مولانا اصلاحی نے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۹ کے تحت یہی معنی اختیار کیا ہے اور بطور ثبوت ایک حماسی شاعر[۲۷] کا یہ شعر پیش کیا ہے:

صفحنا عن بنی ذهل وقلنا القوم إخوان

ترجمہ:ہم نے بنی ذہل کی شرارتوں سے چشم پوشی کی اور خیال کیا کہ
یہ لوگ اپنے ہی بھائی ہیں[۲۸]۔

عربی اشعار کے بعد فارسی اشعار کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔تحویل قبلہ کے متعلق سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۵ میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ مشرق و مغرب دونوں سمتیں اللہ کی ہیں۔ان میں سے جس کی جانب بھی انسان رخ کرتا ہے خدا کی ہی طرف اس کا رخ ہوتا ہے لیکن یہود و نصاریٰ کے درمیان اس مسئلہ میں نزاع ہوا اور دونوں گروہوں نے ہدم معابد و مساجد کا ارتکاب کیا حالانکہ سمتوں اور جہتوں میں سے کسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو اختصاص نہیں۔اس کی قدرت ہر شی کو محیط ہے۔مولانا اصلاحی نے درج بالا آیت کی وضاحت اور اسی مسئلہ کی حقیقت سمجھانے کے لیے فارسی کا درج ذیل مصرع نقل کیا ہے:

ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد[۲۹]

---

[۲۶] ماخذ سابق،ص ۱۷۵۔

[۲۷] اس شاعر کا نام الفند الزمانی ہے اور یہ شعر دور جاہلیت کی مشہور جنگ حرب بسوس سے متعلق ہے۔

[۲۸] ماخذ سابق،ص ۲۵۵۔ دیکھیے شیخ ابی زکریا یحییٰ بن علی تبریزی،شرح دیوان الحماسہ،بدون سنہ وبدون ناشر،جزء اول ص ۱۲۔

[۲۹] ماخذ سابق،ص ۲۵۹۔یہ غالب کی فارسی غزل کا مصرعۂ ثانی ہے۔اس کا پہلا مصرعہ ہے۔"مقصود ماز دیر و حرم جز حبیب نیست"۔دیکھیے کلیات غالب (فارسی) منشی نولکشور،لکھنؤ ۱۸۹۲ء ص ۴۲۱۔

سورۂ مریم آیت نمبر ۲ "ذکر رحمۃِ ربك عبده زکریّا" میں اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کو "اپنا بندہ" کہا ہے۔ ایک انسان کے لیے اس سے بڑا اعزاز و اکرام کیا ہو سکتا ہے؟۔ مولانا اصلاحی نے اسی بات کی تائید کے لیے درج ذیل فارسی شعر پیش کیا ہے:

بولائے تو کہ گر بندۂ خویشم خوانی	ازسر خواجگی کون ومکاں برخیزم (۳۰)

سورۂ ضحیٰ کی آیت "ووجدك عائلا فأغنی" کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا اصلاحی نے حقیقی غنا کا منبع و مصدر ایمان اور معرفت الٰہی کو قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ جس کو یہ دولت حاصل نہیں ہوتی وہ حرص وآز [۳۱] سے کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ اپنے اس خیال کی تائید میں فارسی کا درج ذیل مصرع کس قدر بر محل پیش کیا ہے کہ جس کو فارسی زبان بہت زیادہ نہ آتی ہو وہ بھی اس مصرعے کو پڑھ کر اس کا مفہوم و معنی سمجھ سکتا ہے:

الغنی غنی القلب (حقیقی غنا دل کا غنی ہے) یہ حقیقی غنا ایمان، اللہ کی معرفت اور اس کی کتاب کے نور سے پیدا ہوتا ہے جس کو یہ دولت حاصل نہیں ہوگی وہ دنیا کی حرص سے کبھی پاک نہیں ہو سکتا اور جو حریص ہے اس کا کاسۂ گدائی کبھی بھرتا نہیں۔

کاسۂ چشم حریصاں پُر نہ شد [۳۲]

سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۳ میں حضرت موسیٰؑ کی اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی اور اس کی دید کا تذکرہ ہے اور تجلی ظاہر ہونے کے بعد پہاڑ کے پاش پاش ہونے، حضرت موسیٰؑ کی بے ہوشی، ان کی توبہ اور پہلے مؤمن ہونے کا ذکر ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں مولانا اصلاحی نے صوفیوں اور جوگیوں کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے مشاہدۂ ذات الٰہی کو معرفت الٰہی کا درجۂ کمال قرار دیا ہے اور اس رسائی میں اپنی حدود سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ احساس حیرت و تعجب کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے شہد کی مکھی شہباز کے شکار کو نکلے۔ مولانا کا خیال ہے کہ

---

[۳۰] ماخذ سابق، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۹۷ء ج ۴، ص ۶۳۵۔ یہ خواجہ حافظ شیرازی کا شعر ہے۔ دیکھیے دیوان حافظ شیرازی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۲۶۵۔

[۳۱] آز (فارسی): بخل۔

[۳۲] ماخذ سابق، ج ۹، ص ۴۱۷۔ یہ مولانا روم کا شعر ہے جس کا دوسرا مصرع یہ ہے۔ "تا صدف قانع نشد پر در نشد"۔ لیکن پہلے مصرعے میں "کاسہ" کی جگہ کلیات مثنوی معنوی مولوی میں "کوزۂ" ہے۔ دیکھیے کانون انتشارات علمی، طبع ہشتم، ۱۳۵۷ھ، دفتر اول ص ۶۔

فرشتوں میں سب سے طاقتور حضرت جبرئیلؑ ہیں۔ ان کی رسائی کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ وہیں سے وہ تجلیات ربانی سے بہرہ یاب ہوتے ہیں، اس سے آگے نہیں جاسکتے۔ اگر وہ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے تو ان کے پر جل جائیں گے۔ مولانا نے اپنی اسی بات کی توضیح کے لیے درج ذیل فارسی شعر کا سہارا لیا ہے:

> اوروں کا کیا ذکر سب سے زیادہ عالی مقام اور صاحب قرب حضرت جبرئیلؑ ہیں لیکن ان کی رسائی کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ وہیں سے وہ انوار و تجلیات سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ اگر ذرا اس سے آگے قدم بڑھائیں تو۔

اگر یک سرِ موئے برتر پرم　　　فروغِ تجلی بسوزد پرم (۳۳)

سورۂ حج کی آیت ۱۱ "ومن الناس من يعبد الله على حرف...الخ" میں ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ خدا کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے تب تو ان کا دل خدا پر جمتا ہے اور اگر کوئی آزمائش پیش آگئی تو اوندھے منہ ہو جاتے ہیں اور کفر اور اسلام میں سمجھوتہ کے خواہش مند ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے عناصر اگر مسلمانوں میں داخل ہوئے تو وہ توحید میں یکسو نہیں ہوئے۔ جہاں تک ان کو راہ ہموار نظر آتی وہاں تک تو وہ قافلۂ اسلام کا ساتھ دیتے لیکن جب کوئی آزمائش پیش آجاتی تو وہیں لڑکھڑا جاتے اور خدا سے مایوس و بدگمان ہو کر دوسروں کو ملجا و ماوی بنا بیٹھتے۔ حالانکہ توحید کا تقاضا صرف اس وقت پورا ہوتا ہے جب بندہ ہر خوشی و غم کی حالت میں مطمئن اور اس کی رضا کا طالب رہے۔ موحد کے لیے شکوہ شکایت ہے ہی نہیں۔ شاکیوں بلکہ ایسے مفاد پرستوں کے لیے خدا کے دربار میں کوئی مقام نہیں۔ مولانا اصلاحی نے اس بات کو سرمد کے فارسی اشعار کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی ہے:

> توحید کا تقاضا صرف اس شکل میں پورا ہوتا ہے جب بندہ کلیۃً اپنے آپ کو اپنے رب کی تحویل میں دیدے۔ وہ پھولوں کی سیج پر لٹائے جب بھی راضی رہے اور اگر سر پر آرے چلوا دے جب بھی راضی و مطمئن رہے۔ صرف منفعت کی حد تک جو خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے وہ موحد نہیں بلکہ مشرک ہے اور خدا کے یہاں ایسے ابن الوقتوں اور مفاد پرستوں کی کوئی جگہ نہیں۔ سرمد نے نہایت دوٹوک بات کہہ دی:

---

(۳۳) ماخذ سابق، ج ۳، ص ۳۶۲۔ یہ شیخ سعدی کی مشہور نعت کا ایک شعر ہے۔ دیکھیے مجموعہ کلیات نظم و نثر فارسی، بوستاں، مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنؤ بدون سنہ ص ۶۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یا تن برضائے یار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار می باید کرد یا قطعِ نظر زِ یار می باید کرد (۳۴)

اسی آیت کی مزید تفصیل میں لکھتے ہیں:

"ومن الناس من یعبد اللہ علیٰ حرف" میں جس گروہ کا کردار بیان ہوا ہے، غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہی کردار ابنائے زمانہ کا بھی ہے۔ آج ہم بھی جو اس شر کو مٹانے کے لیے مامور کئے گئے تھے، اسی طرح دور دور سے خدا کی بندگی کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن کو خدا کی کتاب بھی مانتے ہیں لیکن قانون، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست ہر شعبۂ زندگی میں پیروی دوسروں کی کرتے ہیں۔ قرآن کا مصرف اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ جب کوئی مرے تو کچھ حافظ اس کے لیے قرآن خوانی کر کے اس کو بخشوا دیا کریں اگرچہ اس نے خود کبھی اتفاق سے بھی قرآن کو ہاتھ نہ لگایا ہو! ان کے نزدیک قرآن زندوں کے لیے نہیں بلکہ مردوں کے لیے اترا ہے اور وہ ہدایت کے لیے نہیں بلکہ صرف کبھی کبھی چوم لینے کے لیے ہے۔ خوب بات کہی جس نے کہی ہے کہ:

یاران عجب انداز دو رنگی دارند مصحف بہ بغل دین فرنگی دارند (۳۵)

فارسی کے بعد اب اردو اشعار کے برمحل و برموقع نقل کرنے کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ مولانا اصلاحی نے ضرورت و موقع کی مناسبت سے اشعار اور مصرعے نقل کیے ہیں۔ جہاں مصرعہ سے کام چل سکتا ہے وہاں مصرعہ اور جہاں پورے شعر کی ضرورت ہے وہاں پورا شعر نقل کیا ہے۔ انہوں نے یہ انداز عربی، فاسی اور اردو اشعار کے نقل کرنے میں اختیار کیا ہے۔ اس سے مولانا کے ان تینوں زبانوں کے اہم اور مستند شعری سرمایہ پر عمیق نظر کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور ان کا ذوق شعر فہمی بھی معلوم ہوتا ہے۔

سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۷۳ " الذین قال لھم الناس إن الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم إیمانا..." کے تحت لکھتے ہیں کہ جب منافقین نے ان کو ہراساں کرنے کے لیے افواہ پھیلائی کہ قریش پھر حملے کی تیاری کر رہے ہیں تو یہ بات اہل ایمان کے عزم و ثبات میں اضافے کا سبب

---

(۳۴) منشی سید نواب علی نے رباعیات سرمد کا جو منظوم ترجمہ کیا ہے اس میں یہ اشعار اس طرح ہیں:

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دوکار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد یا جاں برہش نثار می باید کرد

(دیکھیے جواہر منظوم ترجمۂ اردو رباعیات سرمد، منشی سید نواب علی، شاہجہانی پریس دہلی، بدون سنہ ص ۴۸)

(۳۵) ماخذ سابق، ج ۵، ص ۲۲۲ - ۲۲۳۔ اس شعر کی تحقیق نہ ہو سکی۔

بن گئی۔ اس لیے کہ رکاوٹیں اور مشکلات مؤمنین کو کمزور کرنے کے بجائے مضبوط، ان کی خفیہ صلاحیتوں کو صیقل اور ہر امتحان ان کے جذبۂ فتح مندی کو مہمیز کرتا ہے۔ مولانا نے اس پورے مسئلے کو ایک بلیغ فقرہ کے ذریعہ یوں واضح کیا ہے:

قاعدہ یہ ہے کہ جس کنویں کے سوتے زوردار ہوں اس کے اندر سے جتنا ہی پانی نکالا جائے اتنا ہی اس کے سوتے اور زیادہ جوش کے ساتھ ابلتے ہیں۔ اسی طرح آگ اگر قوت ور ہو تو گیلی لکڑی بھی اس میں ڈال لیے تو اس کو بھی اپنی غذا بنا کر مزید طاقت ور بن جاتی ہے۔ یہی حال اصحاب عزم و ایمان کا ہے۔ ان کو بھی رکاوٹیں ضعیف کرنے کے بجائے اور زیادہ پرعزم اور پر حوصلہ بنا دیتی ہیں۔ ہر آزمایش ان کی مخفی صلاحیتوں کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور ہر امتحان ان کے لیے فتح مندی کا نیا میدان کھولتا ہے:

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور[۳۶]

اہل ایمان کی تمام طاقت و قوت کا خزانہ در حقیقت یہی "حسبنا اللہ" کا عقیدہ ہے۔ مؤمن یہ سمجھتا ہے کہ جب وہ اللہ کے مقرر کردہ فرض کی ادائیگی خود اس کے حکم سے کر رہا ہے اور اس کے سارے معاملات اللہ کے ذمے ہیں تو وہ غم سے آزاد ہو جاتا ہے اور نفع و نقصان کی اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس کیفیت کو مزید سمجھانے کے لیے مولانا نے یہ شعر نقل کیا ہے:

کیا غم ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف　　کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے[۳۷]

مولانا نے سورہ انفال آیت ۱۹ کے آخری ٹکڑا "وإن الله مع المتقين" کی تفسیر کے ذیل میں بھی یہی شعر نقل کیا ہے مگر پہلے مصرعے میں بعض الفاظ کا فرق پایا جاتا ہے:

"وإن الله مع المتقين" یہ ٹکڑا ساری آیت کی جان ہے اور اس کے دو لفظوں میں کفّار کے لیے دھمکیوں کا اور اہل ایمان کے لیے بشارتوں کا ایک جہان ہے۔ فرمایا کہ اب آئے جس کو آنا ہو اور لڑے جس کو لڑنا ہو اور جمع کرے وہ جتنی جمعیت وہ جمع کر سکتا ہے۔ ایمان کے ساتھ ہم ہیں ہم۔ سبحان اللہ

کیا غم ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف　　کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے[۳۸]

---

[۳۶] ماخذ سابق، ج ۲، ص ۲۱۷۔ یہ غالب کی مشہور غزل کا شعر ہے۔ اس کا پہلا مصرعہ ہے۔ "پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے"۔ دیکھیے دیوان غالب اردو (نسخۂ عرشی) انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، طبع دوم ۱۹۸۲ء ص ۲۰۶۔

[۳۷] ماخذ سابق۔ یہ مولانا محمد علی کی مشہور غزل کا شعر ہے۔ صحیح مصرع اس طرح ہے: "کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف"۔ دیکھیے عبد الماجد دریابادی، محمد علی ذاتی ڈائری، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۲۱ء ص ۹۷۔

اسی جلد میں سورہ توبہ بھی ہے۔ سورہ توبہ کی آیت نمبر ۱۰۰ "والسابقون الأوّلون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان ...الخ " میں اسلامی معاشرہ کے گل سر سبد اور ان کے بعد دوسرے درجہ کے لوگوں کا ذکر خیر کیا گیا ہے تاکہ عام مسلمانوں کے سامنے قابل تقلید افراد کا نمونہ آجائے اور منافقین پر واضح ہو جائے کہ وہ اس جماعت میں شامل ہونے کی کوشش نہ کریں اور اگر اس میں شامل ہونا ہی چاہتے ہیں تو ان مؤمنین کا طریقہ اختیار کریں۔ یعنی یہ کہ اس امت کا ہراول دستہ "السابقون الأوّلون من المهاجرين والأنصار" ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اس دعوت پر لبیک کہا اور اس راہ میں ہر قسم کی مشکل کا پوری ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا، اس کے بعد وہ لوگ ہیں جو سابقین اوّلین کے نقش قدم پر چلے۔ کسی ریا، مصلحت پسندی، خود غرضی، مفاد پرستی یا کسی قسم کی بے یقینی اور نفاق کو اپنے دل میں داخل نہیں ہونے دیا۔ جڑے تو اس طرح نہیں کہ مسلمانوں سے بہ ظاہر ملے ہوئے ہیں اور دشمنان اسلام کا ساتھ دے رہے ہیں بلکہ اس طرح جڑے کہ الگ ہونے کا تصور ہی محال ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۷ میں روزہ کے احکام و مقاصد کی جانب اشارہ ہے۔ مولانا اصلاحی نے اس آیت کے تحت انسان کی صلاحیت کار پر روزے کے اثرات کے بارے میں مؤثر، دلنشین اور مفصل گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ اس سے انسان کے نفس کی تربیت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ روح پر خواہشات و شہوات کا غلبہ کمزور ہو جاتا ہے اور اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خواہش کے پیچھے پیچھے بھاگتا نہیں بلکہ اپنے آپ کو (یعنی روح کو) اپنے رب کی رضا اور اس کے احکام کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ انسان کی قوت کا اصل منبع اس کے دل اور روح کے اندر پایا جاتا ہے۔ اگر دل کمزور اور روح پراگندہ ہو تو دنیا کے کسی گوشے میں بھی کوئی خطرہ نمودار ہو تو ان کے دل دھڑکنے لگتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ بجلی ہمارے ہی خرمن پر گرنے والی ہے لیکن اگر روح بیدار اور دل پُر عزم و پر حوصلہ ہے تو انسان نان جویں پر گزارہ کر کے بھی بازوئے حیدر کے کارنامے دکھاتا ہے۔ مولانا اصلاحی کہتے ہیں:

> اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ہے "كم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة بإذن الله" کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں اور اسی

---

(۳۸) ماخذ سابق، ج۳، ص ۴۵۳۔

چیز کی طرف شاعر نے بھی اشارہ کیا ہے:

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے		کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے[۳۹]

سورۂ نور کی آیت ۴۴ "تقلب اللیل والنہار إن فی ذلك لعبرة لأولی الأبصار" میں تقلیب لیل و نہار کو غور کرنے والوں کے لیے عبرت و نشانی قرار دیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ رات و دن کی آمد و شد یعنی ان میں ایک منٹ یا سیکنڈ کا فرق نہ پیدا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ اللہ واحد کا اختیار ہے۔ مولانا نے اس آیت کے اندر پائے جانے والے لفظ "عبرت" کو انسانیت کا اصلی جوہر قرار دیا۔ جس کے اندر یہ جوہر نہ پایا جائے وہ انسان کے بجائے حیوان ہے۔ مولانا نے اس بات کو مزید دلنشین کرنے کے لیے کسی شاعر کا شعر نقل کیا ہے جس سے بات قاری کے ذہن تک بآسانی پہنچ جاتی ہے:

یہ بات ملحوظ رہے کہ یہی "عبرۃ" انسانیت کا جوہر ہے۔ اگر یہ جوہر کسی کے اندر نہیں ہے تو وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے اور جو آنکھ ظاہر کے اندر باطن کو نہ دیکھ سکے وہ کور ہے۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل		کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا[۴۰]

مختصر یہ کہ "تدبر قرآن" اپنی علمی و ادبی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے ایک منفرد تفسیر ہے۔ اس میں جا بہ جا انشاپردازی، فصاحت و بلاغت، حسن کلام، سلاست و روانی، متانت تحریر، جدت اسلوب، تشبیہ و تمثیل، استعارہ و کنایہ وغیرہ کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اپنے خیالات و نظریات اور بیانات کے اظہار کے لیے جنچے تلے الفاظ کا استعمال "تدبر قرآن" کے ادبی حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ مقفّیٰ و مسجّع عبارت اور ادق الفاظ کے استعمال سے عبارتوں میں کبھی کبھی اغلاق پیدا ہو جاتا ہے، تدبر قرآن میں جان بوجھ کر اس اسلوب نگارش سے پرہیز کیا گیا ہے۔ خالص دینی و مذہبی کتاب ہونے کے باوجود یہ تفسیر شوکت الفاظ، شگفتگی، رنگینی و اثر آفرینی کی خوبی سے مزین نظر آتی ہے۔ اردو تفسیروں میں تدبر قرآن کا خاص مقام ہے۔

---

[۳۹] ماخذ سابق، ج ۱، ص ۱۴۷۔ یہ مشہور شعر خواجہ میر درد کا ہے۔

[۴۰] ماخذ سابق، ج ۵، ص ۴۲۱۔ یہ غالب کا شعر ہے۔ لیکن دیوان میں "قطرہ" کے بجائے "قطرے" ہے۔ دیکھیے شرح دیوان غالب مؤلفہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی، عشرت پبلیشنگ ہاؤس، لاہور ۱۹۵۹، ص ۳۳۱۔

شبلی شکنی کی روایت: پس منظر و پیش منظر

پروفیسر خالد ندیم
شعبۂ اردو اور مشرقی زبانیں، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا (پاکستان)
dr.khalidnadeem@gmail.com

علامہ شبلی پر ندوۃ العلما اور اس کے پس منظر میں جو تنقید، تنقیص یا ہنگامہ آرائی ہوئی، وہ اَب تاریخ کا حصہ ہے؛ لیکن ادبی دنیا میں بھی ان پر کچھ کم کیچڑ نہیں اچھالا گیا۔ اگرچہ ان کی علمی و ادبی خدمات کو تسلیم کیا جا چکا ہے اور بطور شاعر، مؤرخ، نقاد، انشاپرداز اور دانشور ان کی صلاحیتیں مسلمہ ہیں، جس کا ثبوت ان کی رحلت کے ایک صدی بعد تک ان کی تصانیف کی متواتر اشاعت سے ملتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ابتدائی طور پر ظاہر ہونے والا شبلی مخالف رویہ بتدریج شبلی شکنی کی روایت میں بدل چکا ہے۔

ادبی دنیا میں علامہ شبلی کی اوّلین مخالفت مولوی عبدالحق کی طرف سے ہوئی، جو وقتاً فوقتاً اور جا و بے جا ان کے بارے میں ایسے جملے ادا کرتے رہے، جن سے شبلی کے بارے میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ ساتھ ہی ساتھ مولوی صاحب نے کوشش کر کے تصانیفِ شبلی کے بارے میں ایسی فضا تیار کی، جس سے شبلی کی علمی حیثیت مشکوک ہو جائے۔ یاد رہے کہ مولوی عبدالحق علی گڑھ میں شبلی کے شاگرد تھے اور بعد ازاں جس انجمن ترقی اردو کے وہ جنرل سیکرٹری ہوئے، شبلی نعمانی اس کے بانی سیکرٹری (جنوری ۱۹۰۳ء-فروری ۱۹۰۵ء) رہ چکے تھے۔ البتہ مولوی عبدالحق کا شخصی جھکاؤ مولانا الطاف حسین حالی کی طرف تھا، جو آہستہ آہستہ جانب داری سے جا ملا۔ وہ حالی و شبلی کے تعلقات کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ نہ کر سکے اور حیاتِ جاوید کو 'کتاب المناقب' اور 'مدلل مداحی' قرار دینے پر شبلی سے زندگی بھر برہم رہے، البتہ یہ بھول گئے کہ انھی شبلی نے حیاتِ سعدی کو 'بے مثل' قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> دلچسپ بات یہ ہے کہ انجمن ہی نے شبلی پر ایسا خطرناک حملہ کیا کہ جس سے وقتی طور پر شبلی کی شہرت کو خاصا نقصان پہنچا۔ میری مراد ہے شبلی کی شعر العجم پر حافظ محمود شیرانی کے اُس طویل تنقیدی مضمون سے، جو انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے اردو میں قسط وار شائع ہوا اور بعد میں

وہ طویل مضمون کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔ ایسے شواہد موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مضمون مولوی عبدالحق کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔[۱]

مولوی صاحب کی فرمائش یا ترغیب پر شعر العجم پر حافظ محمود شیرانی کی یہ تنقید، جسے تنقیص کہنا مناسب ہے، رسالہ اردو کے متعدد شماروں (اکتوبر ۱۹۲۲ء، جنوری ۱۹۲۳ء، اپریل ۱۹۲۳ء، اکتوبر ۱۹۲۳ء، اپریل ۱۹۲۴ء، جنوری ۱۹۲۶ء اور اکتوبر ۱۹۲۹ء) میں شائع ہوئی۔ ان شماروں کا دَورانیہ سات برسوں پر پھیلا ہوا ہے، جس سے مدیر و محقق کی مستقل مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی دوران میں منشی محمد امین زبیری کے مرتبہ خطوطِ شبلی کا مقدمہ لکھتے ہوئے مولوی صاحب نے اپنی خواہش کو پیشین گوئی کے طور پر بیان کیا، لکھتے ہیں:

مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے نونی لگنی شروع ہو گئی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا، وہ بہت سخت مزاج ہے، مگر آخری اِنصاف اُسی کے ہاتھ ہے۔ ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی۔[۲]

شبلی کی کتابوں کو تو 'نونی' نہ لگی، لیکن مولوی عبدالحق کے یہ تنقیدی جملے ان کی ناقدانہ حیثیت پر سوالیہ نشان ضرور لگا گئے۔

***

جس زمانے میں علامہ شبلی نعمانی ندوہ کے لیے سرگرم تھے، منشی محمد امین زبیری (۱۸۷۰ء-۱۹۵۸ء) ریاست بھوپال میں صیغۂ تاریخ کے مہتمم کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بیگم بھوپال کو ندوہ اور سیرت النبیؐ سے بہت دلچسپی تھی، چنانچہ ان منصوبوں کے لیے انھوں نے فراخ دلی سے اخلاقی اور مالی تعاون کیا۔ علامہ شبلی اور بیگم صاحبہ کے درمیان سفیر کی ذمہ داری امین زبیری ادا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں زبیری صاحب کے نام شبلی کے اکتیس خطوط دستیاب ہوئے ہیں، جو مکاتیبِ شبلی کی جلد اوّل میں شامل ہیں۔ ان تمام خطوط میں شبلی نے انھیں 'محبی' کے لفظ سے مخاطب کیا ہے اور خود امین زبیری کو شبلی سے بہت عقیدت تھی۔

سید سلیمان ندوی نے شبلی نعمانی کے مکاتیب پر مشتمل دو مجموعے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں مرتب

---

[۱] ڈاکٹر خلیق انجم: 'شبلی کی حمایت میں'، مشمولہ شبلی نعمانی معاندانہ تنقید کی روشنی میں مصنفہ سید شہاب الدین دسنوی، کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام، ۱۹۸۹ء، ص ۷۔

[۲] مولوی عبدالحق: مقدمہ خطوطِ شبلی، بھوپال: ظل السلطان بک ایجنسی، س ن، ص ۲۶۔

کر دیے تھے۔ مرتب نے مکاتیبِ شبلی کی اشاعت کا خیال اکتوبر ۱۹۰۹ء کے الندوہ میں پیش کیا تھا، جس کے نتیجے میں ملک بھر سے ہزاروں خطوط جمع ہو گئے۔ مرتب کے مطابق، 'جلد اوّل کے اکثر خطوط مولانا کی زندگی میں صاف ہو کر ان کی نظر سے گزر چکے تھے'، لیکن اس کی اشاعت کا مرحلہ طے نہ ہو سکا۔ ۱۹۱۴ء میں شبلی کی رحلت کے بعد دوبارہ اعلان کیا گیا تو 'ہر طرف سے خطوط کی بارش' ہونے لگی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ہزاروں خطوط میں سے صرف دو مجموعے ہی کیوں مرتب ہو سکے، اس کا جواب سید سلیمان جلد اوّل کے دیباچے میں دیتے ہیں:

> میں نے صرف اُن خطوط کا انتخاب کیا ہے، جن سے یا تو مولانا کے ذاتی سوانح کا کوئی واقعہ ظاہر ہوتا ہے یا ان میں کسی علمی، اصلاحی اور قومی مسئلے کا ذکر ہے یا انشاپردازی کا ان میں کوئی نمونہ موجود ہے۔ ان ہی اصول ہائے ثلاثہ کی رہبری سے ہزاروں خطوط کے انبار سے یہ چند دانے چھانٹ کر الگ کیے گئے ہیں، ورنہ ایک سچے مومن کے نزدیک تو قرآن کی سب سورتیں برابر ہی ہیں۔[۳]

خطوں کی جمع آوری کے لیے ان اعلانات اور ان کے جواب میں ہزاروں خطوط کی موصولی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات ملک بھر میں مشتہر ہوئی ہو گی، ایسے میں یہ بات تسلیم کرنے میں تامل ہو سکتا ہے کہ عطیہ فیضی یا ان کی بہنیں اس خبر سے لاعلم رہی ہوں۔ البتہ عطیہ کے ۱۹۴۶ء کے مضمون سے، جس کا ذکر ذرا بعد آئے گا، معلوم ہوتا ہے کہ مکاتیبِ شبلی کی ترتیب کے دور میں سید سلیمان ندوی کو یہ خطوط دستیاب نہیں ہوئے تھے، ورنہ عطیہ کے نام شبلی کے یہ خطوط 'ذاتی سوانح'، 'علمی، اصلاحی اور قومی مسئلے' یا 'انشاپردازی' سے ایسے بے نیاز نہیں تھے کہ ان سے صرفِ نظر کیا جا سکتا؛ البتہ مرتب کے مذکورہ بالا اقتباس کے آخری جملے سے مکتوب نگار کی 'تقدیس' اور ان کی ذات اور کردار کی بابت مرتب کی احتیاط کا اندازہ لگایا جا سکتا۔ بہر حال، ان مجموعوں کی اشاعت کے برسوں بعد جب امین زبیری کو عطیہ فیضی اور زہرا بیگم کے نام شبلی کے خطوط کا علم ہوا تو انھوں نے ان کو مرتب کر کے شائع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا:

> جس وقت یہ نادر مجموعہ جناب زہرا بیگم صاحبہ اور جناب عطیہ بیگم صاحبہ کی عنایت سے میرے ہاتھوں تک پہنچا، اُسی وقت میں نے مکاتیبِ شبلی میں اس کمی کو محسوس کیا اور خیال آیا کہ اس کو شائع کرایا جائے، لیکن چونکہ میں محض مالی دِقت کے لحاظ سے شائع نہیں کر سکتا تھا، اس لیے میں

---

[۳] سید سلیمان ندوی: مقدمہ مکاتیبِ شبلی اوّل، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۔

نے مولانا شبلی مرحوم کے ایک نہایت ارادت مند فاضل دوست کو، جن کی ذرا سی توجہ اس کی اشاعت کی کفیل ہو سکتی تھی، لکھا۔ لیکن جنابِ موصوف نے بعض وجوہ سے ان خطوط کی اشاعت ہی مناسب تصور نہ فرمائی، اس لیے میں بھی کسی قدر متردّد ہو گیا اور دیگر دوستوں اور بزرگوں سے مشورہ لیا۔ ان میں سے بعض نے کسی قدر ترمیم کے ساتھ اور بعض نے علیٰ حالہٖ شائع کرنے کی رائے دی اور خصوصاً مولوی عبدالحق صاحب نے تو اشاعت پر مجبور ہی کر دیا۔[۴]

شبلی کی کتابوں کو 'نونی' لگنے کی پیشین گوئی اور تنقید شعر العجم کے ذریعے شبلی کے علمی وقار کو مسمار کرنے کے بعد ان کی شخصیت کے انہدام کا یہ بہترین موقع تھا، جسے مولوی عبدالحق کسی طور ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب کے خیال میں 'بڑا ظلم ہو گا، اگر یہ خط یونہی پڑے ردّی میں مل جائیں اور تلف ہو جائیں اور دنیا اس نعمت سے محروم رہ جائے' اور یہ کہ 'اگر یہ خط نہ چھپے تو اس کا الزام آپ [منشی محمد امین] کے سر رہے گا اور اردو زبان کی عدالت میں آپ سب سے بڑے مجرم سمجھے جائیں گے'۔[۵]

مولوی صاحب کے 'اصرار' پر امین زبیری نے یہ مجموعۂ مکاتیب مرتب کر دیا اور مالی دشواریوں کے باوجود اپنے اشاعتی ادارے ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال سے شائع کر دیا، لیکن مولانا شبلی کے 'نہایت ارادت مند فاضل دوست' کے بارے میں ان کے دل میں گرہ بندھ گئی؛ حالانکہ اس موقع پر شبلی سے متعلق مکتوب الیہم اور مرتب کا رویہ بہت مثبت رہا، جس کا اظہار خطوطِ شبلی کے 'التماس وانتساب' سے ہوتا ہے۔ امین زبیری لکھتے ہیں:

(۱) غالباً اردو فارسی زبان میں ایسے خطوط کا یہ پہلا مجموعہ ہو گا کہ جو ایک علامۂ دَوراں نے خواتین کے نام لکھے ہوں اور اس میں عورتوں کی مختلف خصوصیات کے متعلق ایسے گراں مایہ خیالات ہوں۔

(۲) ان بیگمات کے دل میں مولانائے مرحوم کی خاص عظمت و محبت ہے۔ یہ خطوط ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں اور میں نے دیکھا کہ نہایت حفاظت کے ساتھ ان کی آہنی الماری میں رکھے ہوئے تھے اور ہزاروں اطمینان دِلانے کے بعد مجھے اجازت دی گئی کہ میں بمبئی میں اپنے قیام گاہ پر ان کو نقل کروں۔

---

[۴] منشی محمد امین زبیری (مرتب): خطوطِ شبلی، ص ۳۔

[۵] مولوی عبدالحق: مقدمہ خطوطِ شبلی، ص ۲۶۔

(۳) یہ دونوں بہنیں جس وقت مولانا کا تذکرہ کرتی ہیں اور ان کے واقعات سناتی ہیں تو ان کے لب ولہجہ اور الفاظ سے وہ احترام، وہ عظمت اور وہ محبت نمایاں ہوتی ہے، جس کا تعلق سننے اور دیکھنے ہی سے ہے۔[۶]

شبلی نعمانی کے لیے 'علامۂ دَوراں' اور 'مولانائے مرحوم' کے القاب امین زبیری کے دل میں مکتوب نگار کے لیے احترام کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی طرح مکتوب الیہم علامہ کے خطوط کو 'ہر چیز سے عزیز' رکھتی ہیں اور علامہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے لب ولہجہ اور الفاظ سے احترام، عظمت اور محبت نمایاں ہوتی ہے؛ گویا اس مجموعے کی اشاعت تک مرتب یا مکتوب الیہم کے ہاں علامہ شبلی کے بارے میں کسی منفی جذبے یا خیال کا شائبہ نہیں ملتا۔

خطوطِ شبلی کی بنیاد پر اسماعیل یوسف کالج میگزین بمبئی (۱۹۳۴ء) میں نجیب اشرف ندوی کا مضمون 'شبلی اور بمبئی'، تماہی "ہندوستانی" الہ آباد (اکتوبر ۱۹۳۶ء) میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کا مضمون 'مولانا شبلی بحیثیت شاعر' اور کتاب (اپریل ۱۹۴۵ء) میں وحید قریشی کا مضمون 'شبلی کی حیاتِ معاشقہ' شائع ہوا؛ جب کہ نومبر ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے 'شبلی کی شخصیت خطوں کے آئینے میں' کے نام سے سلطان حیدر جوش کی ایک گفتگو نشر ہوئی۔ البتہ شبلی کی شخصیت کے بارے میں مرتبِ خطوطِ شبلی کا پہلا منفی ردّ عمل حیاتِ شبلی کی اشاعت کے بعد "ذکرِ شبلی" کے نام سے ۱۹۴۶ء میں منظر عام پر آیا۔ نجیب اشرف ندوی، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی اور سلطان حیدر جوش وغیرہ کی تحریریں اور تقریریں گمنامی کی نذر ہو گئیں، لیکن وحید قریشی کے مقالے کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔

***

۱۹۴۳ء میں سید سلیمان ندوی کی مؤلفہ حیاتِ شبلی کا شائع ہونا تھا کہ شبلی کے خلاف ایک محاذ کھل گیا۔ مؤلف کی طرف سے علی گڑھ اور سرسید سے شبلی کے اختلافات کو نمایاں کرنے اور عطیہ فیضی کے نام شبلی کے خطوں کو نظر انداز کرنے سے حیاتِ شبلی متنازع ہو گئی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ علامہ شبلی اور "حیاتِ شبلی" میں امتیاز روانہ رکھا گیا۔ مخالفت مؤلفِ حیاتِ شبلی کی مقصود تھی، لیکن نشانہ شبلی بنے۔ اس سلسلے میں ایک سخت ردّ عمل ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر وحید قریشی کے مقالے

---

[۶] منشی محمد امین زبیری (مرتب): خطوطِ شبلی، ص ۳-۴۔

'شبلی کی حیاتِ معاشقہ' کی صورت میں سامنے آیا، جو انھوں نے حلقۂ اربابِ ذوق میں پڑھا۔ یہ مقالہ اسی برس اپریل میں رسالہ "کتاب" اور پھر مئی میں "ادبی دنیا" میں شائع ہوا۔ اس بحث میں عطیہ فیضی (ادبی دنیا، جولائی اگست ۱۹۴۶ء)، خالد حسن قادری (نگار)، علامہ نیاز فتح پوری (نگار)، منشی محمد امین زبیری (شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق ۱۹۴۶ء)، قاضی عبدالغفار (پیام، ۶/ جون ۱۹۴۶ء)، مولانا عبدالماجد دریابادی (الاصلاح)، مولوی احمد مکی (ہماری کتابیں، اگست ستمبر ۱۹۴۶ء)، عبدالرزاق ملیح آبادی (یادِ ایام، دسمبر ۱۹۴۶ء) اور بمبئی کے بعض ہفتہ وار اخباروں نے حصہ لیا۔ ان مضامین و تاثرات کی روشنی میں، ترمیم و اضافے کے بعد وحید قریشی کا زیرِ بحث مقالہ ۱۹۵۰ء میں مکتبہ جدید لاہور کی طرف سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔

مؤلفِ حیاتِ شبلی کو یہ دعویٰ نہیں تھا کہ 'یہ تالیف سوانح عمریوں کے صحیح اصول پر پوری منطبق ہے'۔ البتہ انھوں نے کی کوشش کی تھی کہ 'جو کچھ معلوم ہو، اس کو بے کم و کاست سپردِ قلم کر دیا جائے'، لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ:

> محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں، وہاں بدگمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے ان ہی پر پڑتی ہیں اور ان کے تکرار اور اعادہ میں ان کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں؛ لیکن یہ دونوں باتیں در حقیقت نفسیاتِ فطرت کے مطابق ہیں اور اس میں معتقد و منتقد دونوں معذور ہیں۔[۷]

حیاتِ شبلی اور شبلی کی حیاتِ معاشقہ انھی دونوں انتہاؤں کی عکاس ہیں۔ سید سلیمان ندوی، عطیہ کے نام شبلی کے خطوں کو سرے سے نظر انداز کر گئے تو وحید قریشی نے ان خطوں کے مندرجات کو اس انداز میں ترتیب دیا کہ من مانے نتائج بر آمد کیے۔ اس بات کا اندازہ وحید قریشی کے درج ذیل جملے سے لگایا جاسکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> شبلی جیسے مذہبی خیالات کے آدمی کا عشق اور پھر وہ بھی بڑھاپے میں، مانی جانے والی بات نہیں۔ شبلی کے طرف داروں کے نزدیک تو ان باتوں کا ذکر ہی لاحاصل ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں کا تعلق شبلی کی ادبی زندگی سے مطلق نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف اسی ایک خیال نے شبلی کی شاعرانہ عظمت کو ہماری نظروں سے بہت حد تک اوجھل رکھا ہے۔[۸]

---

[۷] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۰۸ء، ص ۶۔

[۸] وحید قریشی: شبلی کی حیاتِ معاشقہ۔ مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۱۷۔

گویا فریقین اعتدال کی راہ اختیار کرنے کو تیار نہیں۔ شبلی کے بعض اشعار کی تعبیر کرتے ہوئے وحید قریشی اس انتہا کے بھی آخری سرے تک جا پہنچتے ہیں۔ ان کے نزدیک 'اگر مولانا کا عشق اوّل اوّل حجاب کی منزل میں تھا تو اس کے ساتھ ہی اس کا جنسی پہلو بھی ابتدا ہی سے نمایاں تھا'،[۹] حالانکہ شیخ محمد اکرام کا خیال ہے:

> اس قسم کے اشعار کو شبلی کے لکھنوی مذاقِ شعر کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے کئی چشموں سے فیض حاصل کیا تھا اور اخیر میں عام طور پر ان کا مذاق بے حد سلجھ گیا تھا، لیکن ان کی ابتدائی ادبی تربیت اودھ پنچ اور پیامِ یار کے صفحات سے ہوئی تھی اور یہ اثر اخیر تک کچھ نہ کچھ قائم رہا، چنانچہ ...... شبلی کی محبت کے جنسی یا غیر جنسی پہلوؤں پر رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔[۱۰]

بظاہر تو وحید قریشی نے شبلی کے عشق کے جنسی پہلو پر بحث کتاب کے ذیلی عنوان 'نفسیاتی مطالعہ' کی وجہ سے کی ہو گی، لیکن ان کے مقالے میں کسی ایک ماہر نفسیات کی رائے یا کسی ایک نفسیاتی اصول کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ ان کے خیالات کی ساری عمارت محض قیاسات کی بنیادوں پر استوار ہے۔ حالات و واقعات کے بیان اور شبلی کی خطوط اور شاعری سے اقتباسات کے باوجود غالباً وحید قریشی کو قارئین پر اعتماد نہیں تھا، چنانچہ انھیں مجبوراً اِن جملوں پر مقالے کو ختم کرنا پڑا کہ 'شبلی ناکام جیے اور ناکام مرے۔ یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ'،[۱۱] جب کہ شیخ محمد اکرام سمجھتے ہیں کہ 'شبلی کے قلم کی ایک ایک سطر موجود ہے اور اردو ادب کا جزو بنتی جاتی ہے۔ شبلی کے خیالات آج بھی فضا میں گونج رہے ہیں اور قوم کے دِل و دِماغ پر ان کا سکہ برابر جاری ہے'۔[۱۲]

وحید قریشی کی ساری تحقیق اور نتائج کو ان کے ایک جملے کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں:

> بیگم صاحبہ جنجیرہ کے خاندان سے مولانا کے دوستانہ تعلقات قسطنطنیہ کے زمانے میں قائم ہوئے تھے، جو مئی ۱۸۹۲ء کا واقعہ ہے اور غالباً اُس وقت عطیہ ایک آدھ برس کی بچی تھی۔[۱۳]

---

[۹] ماخذ سابق، ص ۳۸۔

[۱۰] شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، بمبئی: تاج آفس، ۱۹۴۶ء، ص ۱۵۱۔

[۱۱] وحید قریشی: شبلی کی حیاتِ معاشقہ، ص ۸۰۔

[۱۲] شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، ص ۲۷۲۔

[۱۳] وحید قریشی: شبلی کی حیاتِ معاشقہ، ص ۵۰۔

حالانکہ عطیہ فیضی ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئی تھیں، یوں ۱۸۹۲ء میں ان کی عمر پندرہ برس ہونی چاہیے اور ۱۹۰۶ء میں مشیر حسین قدوائی کے یہاں انچاس سالہ شبلی سے ملاقات کے وقت انتیس برس۔ چنانچہ محقق کے اس 'غالباً' کا نتیجہ تحقیق یہی ہونا چاہیے تھا کہ 'شبلی جیسے مذہبی خیالات کے آدمی کا عشق اور پھر وہ بھی بڑھاپے میں'۔

وحید قریشی کی یہ 'تحقیق' اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک 'چیزے دِگر' کی حیثیت رکھتی تھی، چنانچہ اس کتاب کا چھپنا تھا کہ منشی محمد امین زبیری اور شیخ محمد اکرام بھی میدان میں اُتر آئے اور ادبی دنیا کے صلاح الدین کی دعوت پر عطیہ فیضی کو بھی اپنے تاثرات قلم بند کرنے کا موقع مل گیا۔[۱۴]

ڈاکٹر وحید قریشی کا شمار اردو زبان و ادب کے لائق اساتذہ اور مستند ناقدین و محققین میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد کسی موقع پر انھوں نے اپنے خیالات سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ انھوں نے زیرِ بحث کتاب کو تلف کرنے کی شعوری کوشش کی؛ لیکن چونکہ تیر کمان سے نکل چکا تھا، اس لیے ایک بات یار لوگوں کے ہاتھ آگئی اور صدیوں کے لیے گرمیٔ محفل کا سامان ہو گیا۔ حال ہی میں عرفان احمد خاں نے وحید قریشی کی اس کتاب کو مرتب کر کے شائع کیا۔ 'عرضِ مرتب' میں ان کا کہنا ہے:

> اپنے وقتوں (۱۹۵۰ء) میں اس کتاب نے بڑا تہلکہ مچایا تھا، مگر علما کے شور مچانے پر کتاب کے مصنف نے اپنی تصنیف اور اس کے مندرجات سے دستبرداری کا 'سرد اعلان' کر دیا، بلکہ مصنف نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے 'بااثر' ہو جانے پر خود اپنی ہی کتاب کو اُن تمام لائبریروں سے 'غائب' کرا دیا، جو ان کے یا ان کے دوستوں کے حلقۂ اثر میں تھیں۔[۱۵]

ان بیانات سے یہ اندازہ نہیں ہو رہا کہ مرتب علما کے شور پر معترض ہیں یا 'بااثر' وحید قریشی کی شخصیت کو کمزور ثابت کرنا مقصود ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کو براہِ راست جاننے والی کتنی ہی علمی شخصیات، اللہ انھیں تا دیر سلامت رکھے، ابھی موجود ہیں۔ ان کی رائے میں وحید قریشی مرحوم مضبوط اعصاب کے مالک تھے اور وہ کسی کے رعب و دبدبے میں آنے والے نہ تھے۔ کسی دباؤ میں

---

[۱۴] ماخذ سابق، ص ۱۲۔

[۱۵] عرفان احمد خاں (مرتب): شبلی کی حیاتِ معاشقہ مصنفہ وحید قریشی، ٹی اینڈ ٹی، لاہور، طبع سوم ۲۰۱۳ء، ص ۱۶۔

آجانا ان کی شخصیت پر الزام کے برابر ہے؛ البتہ ان کے فکری ارتقا نے انھیں اپنے تنقیدی فیصلوں سے رجوع کرنے پر مجبور کیا ہو تو الگ بات ہے۔

***

سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی کے معاونین میں منشی محمد امین زبیری کو بھی شمار کیا تھا۔ مولانا عبد السلام ندوی کے ابتدائی مسوّدے اور اقبال احمد خاں سہیل کی مؤلفہ سیرتِ شبلی کے بعد ان کے فراہم کردہ لوازمے کو سب سے اہم قرار دیا اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ 'محبی منشی محمد امین صاحب زبیری علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے پرانے فائلوں سے بہت سی مفید تحریریں، نظمیں اور واقعات نقل کر کر کے بھیجتے رہے'۔[۱۶]

منشی امین زبیری کے لیے جو اندازِ تخاطب، یعنی 'محبی' شبلی نے تاحیات اختیار کیا، مؤلفِ حیاتِ شبلی نے اُسے برقرار رکھا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں امین زبیری کی محبت اور احترام کے قائل رہے۔ پھر حیاتِ شبلی میں ایسا کیا تھا کہ امین زبیری نہ صرف مؤلفِ حیاتِ شبلی سے بے زار ہوئے، بلکہ اپنے ممدوح سے بھی متنفر ہوگئے اور ذکرِ شبلی کے نام سے ایک سخت تبصرہ لکھ ڈالا۔ یاد رہے کہ منشی محمد امین زبیری ۱۹۳۱ء میں بھوپال سے سبک دوش ہوئے اور علی گڑھ کو مستقر بنایا، دوسری جانب سید سلیمان ندوی درِ شبلی سے اُٹھے اور آستانۂ اشرفیہ پر جھک گئے۔ یوں دیوبند اور علی گڑھ کے مابین قدامت و جدت کی آویزش دو مصنفوں کے مابین تصادم کی صورت اختیار کر گئی۔ ذکرِ شبلی کے پس منظر میں یہی جذبہ کارفرما تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ 'یہ دراصل سرسید مرحوم کی عقیدت کا تقاضا بھی ہے اور ایک قومی خدمت بھی ہے کہ دنیا ایک عالم فاضل کے افترائیات اور اختراعیات [کذا] سے متاثر نہ ہو'۔[۱۷] گویا ایک جانب سرسید کا دِفاع کیا جائے اور دوسری جانب سید سلیمان ندوی کے بعض بیانات کی حقیقت منکشف کی جائے۔

عجیب بات ہے کہ تیس بتیس برس گزرنے کے بعد بھی امین زبیری پر شبلی کی 'حقیقت' ظاہر نہ ہو سکی، حالانکہ وہ ۱۹۲۶ء میں خطوطِ شبلی بھی مرتب کر چکے تھے۔ حیاتِ شبلی پر ان کے ردّ عمل کو وقتی نہیں کہہ سکتے، بلکہ اس غیظ و غضب کی تپش ۱۹۵۲ء تک محسوس ہوتی رہی، جب انھوں نے شبلی کی

---

[۱۶] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۶۔

[۱۷] منشی محمد امین زبیری: ذکرِ شبلی، مکتبہ جدید، لاہور ۱۹۵۳ء، ص ۹۔

زندگی کا ایک رنگین ورق (۴۱ صفحات) میں مزید رنگ بھرے اور اسے شبلی کی رنگین زندگی (۹۶ صفحات) کے نام سے شائع کیا۔ ذکرِ شبلی کے دیباچے میں امین زبیری نے حالات کے تغیر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قیامِ علی گڑھ کے زمانہ میں میری علامہ سید سلیمان سے جو وقتاً فوقتاً ملاقات ہوئی، اس میں ان کی بعض باتوں سے محسوس ہوا کہ وہ علی گڑھ اور سرسید سے سخت تعصب، بلکہ نفرت رکھتے ہیں اور مسلم لیگ کی حقارت اور مسلم سیاست سے بیزاری ان کے دل کی گہرائیوں اور جسم کے ریشہ ریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ [۱۸]

امین زبیری کی اس بات کو محض تفنن طبع کا سامان نہیں سمجھا جا سکتا، اس میں کچھ حقائق بھی شامل ہیں۔ 'علی گڑھ اور سرسید سے سخت تعصب، بلکہ نفرت' تو دیوبند کا مطمح نظر تھا ہی، 'مسلم لیگ کی حقارت اور مسلم سیاست سے بیزاری' کا اظہار بھی دارالمصنّفین کے مہمان خانے میں کانگریسی رہنماؤں کے بارہا قیام سے مل جاتا ہے۔ ان معاملات میں سید سلیمان ندوی کا رویہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، محمد امین زبیری کے جوابی حملے کا جواز فراہم نہیں ہوتا۔ انھیں ایک دکھ اس بات کا تھا کہ سید سلیمان ندوی نے خطوطِ شبلی شائع کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تھا، بلکہ 'بعض وجوہ سے ان خطوط کی اشاعت ہی مناسب تصور نہ فرمائی' اور دوسرا دُکھ اس کا کہ ان کی خواہش کے باوجود علی گڑھ اور سرسید سے متعلق ابواب انھیں دِکھائے نہیں گئے۔ افسوس کہ امین زبیری ناراض تو تھے سید سلیمان ندوی سے اور ان جرائم کی عبرت ناک سزا بھی انھیں کو دینا چاہتے ہوں گے؛ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ ان کے اس عمل سے نقصان کس کا ہوگا، چنانچہ جنھیں وہ 'علامۂ دَوراں' اور 'مولانائے مرحوم' کے ناموں سے یاد فرماتے تھے، ان کے غیظ و غضب کا شکار ہو گئے۔ ذکرِ شبلی کی اشاعتِ اوّل کا معاملہ نہایت دلچسپ ہے، خود امین زبیری کی زبان سے سنیے:

۱۹۴۶ء میں ایک مکمل تنقید اڑھائی سو صفحے کی لکھی، جو کتب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اشاعت سے قبل ایک صاحب نے حق تالیف ادا کرنے کے معاہدے پر، جو مولوی عبدالحق کے ذریعے سے ہوا تھا اور بحق انجمن منتقل کر دیا گیا تھا، مسودہ لے لیا؛ مگر بعد کو حکیم اسرار احمد کریوی نے، جو انجمن کے سفیر خاص تھے، مولوی صاحب کی اجازت سے اس پر قبضہ کر لیا اور صرف چند نسخے شائع کیے اور بہ تعداد کثیر تلف کر دیے گئے۔ کیوں تلف کیے

---

[۱۸] ماخذ سابق، ص ۶–۷۔

گئے، یہ راز حل نہ ہوا۔[19]

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولوی عبدالحق بھی ہاتھ کھینچ گئے اور شبلی شکنی کے اس منصوبے میں سرپرست و معاون نہ بنے۔ 'صرف چند نسخے شائع' کرنے کا مقصد محض ماحول کو گرمانا ہو سکتا ہے، ورنہ وہ باقی نسخوں کو تلف نہ کرتے۔ حیرت ہے، امین زبیری پر یہ راز نہ کھل سکا۔

اس تلف شدہ کتاب کا کوئی نسخہ راقم کی دسترس میں نہ آسکا، البتہ اس کا دوسرا اڈیشن پیش نظر ہے، جو مکتبہ جدید لاہور سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا اور جسے مرتب نے سابقہ مسوّدے کا خلاصہ قرار دیا ہے۔[20] یہ کتاب دراصل سید سلیمان ندوی کے بیانات کی تردید پر مشتمل ہے۔ اس کے بالاستیعاب مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ محمد امین زبیری تنقیص کے نام پر تنقیدی فریضہ انجام دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ابتدا میں مبصر نے شبلی کی عظمت سے متعلق دیباچہ حیاتِ شبلی سے پانچ اقتباسات پیش کر کے بالترتیب سب کا مفصل جواب دیا۔ علی گڑھ کی زندگی کے بارے میں مؤلفِ حیاتِ شبلی کے بیانات کی تردید کی، سرسید سے 'کشمکش اور اختلاف' اور اس سلسلے کی 'نو شعاعوں' پر تفصیلی بحث کی اور شبلی کی زندگی کے بعض واقعات سے ان کی شخصیت کو نشانۂ تنقید بنایا۔ اندازِ تنقید ملاحظہ فرمائیے:

> بمبئی میں وہ ایک نہیں، کئی تیروں کے گھائل ہوئے تھے اور ایک پریشان بوالہوس کی طرح، اور اسی ہوس و پریشاں نظری میں ایک ممتاز و تعلیم یافتہ گھر کو برائے چندے مطمحِ نظر بنا لیتے ہیں اور خطوط میں اور شعر و سخن میں وہ جذبات و میلانات ظاہر کرتے ہیں، جو شبلی جیسے عالم و فاضل کے چہرہ پر نہیں کھلتے۔[21]

۱۴۸؍ صفحات پر مشتمل اس تبصرے کا مرکزی خیال انھیں کے الفاظ میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

> مولانا شبلی کے اس احترام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، جس کے کہ وہ صحیح طور پر مستحق ہیں، اس امر کو بیان کرنے میں کوئی باک نہیں کہ وہ اپنے اور ابنِ خلدون کے قول کے مطابق، سیاست سے بعید ترین تھے اور انھوں نے سیاسیاتِ ہند کو مطلق نہیں سمجھا تھا۔ سرسید کی پالیسی پر بیدردانہ اعتراض

---

(19) ماخذ سابق، ص ۸۔

(20) ماخذ سابق، ص ۸۔

(21) ماخذ سابق، ص ۱۴۴۔

ان کی سیاسی کوتاہ نظری کی بین دلیل ہے، جو پالیسی روز بروز صحیح سے صحیح تر ثابت ہوئی اور بالآخر پاکستان پر منتج ہوگئی۔ [۲۲]

ذکرِ شبلی سے امین زبیری کو اطمینان نہ ہوا تو انھوں نے اسی برس (۱۹۴۶ء) خطوطِ شبلی کو بنیاد بنا کر شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق مرتب کر ڈالا۔ یہ محض اکتالیس صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ تھا، جسے بعد میں اضافہ و ترمیم کے ساتھ ۱۹۵۲ء میں "شبلی کی رنگین زندگی" کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس وقت یہی اڈیشن پیش نظر ہے، جسے جمیل نقوی نے مرتب کیا۔ مرتب نے درست لکھا ہے کہ 'شبلی کی رنگین زندگی کچھ ایسی رنگین نہ تھی، جسے پیش کرتے ہوئے تکلف محسوس ہو' اور یہ کہ 'اُن [عطیہ] کے ساتھ مولانا شبلی کو جو لگاؤ تھا، اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مولانا اپنے سابقہ خشک زاہدانہ ماحول سے نکل کر دفعتاً ایک زیادہ خوش گوار اور حیات افروز ماحول سے دوچار ہوئے، جس نے ان کے خوابیدہ جمالیاتی احساسات کو بیدار کر دیا'۔ [۲۳] خود زبیری صاحب مؤلف حیاتِ شبلی کے اس بیان کے پیچھے پناہ لیتے ہوئے کہ 'عشق و محبت کا جذبہ فطرتِ انسانی کا خمیر ہے'... فرماتے ہیں کہ 'ہمارا فلسفۂ اخلاق تو عشق نفسانی کو بھی ایک فضیلت قرار دیتا ہے'، چنانچہ ان کے خیال میں 'اگر مولانا شبلی کے عشق و محبت کے افسانوں کو بیان کیا جائے تو ان کی علمی و قومی عظمت میں کوئی فرق نہیں آسکتا' اور 'یہ مختصر تبصرہ نہ تو شبلی کی تفضیح و تضحیک ہے اور نہ بدطینتی پر مبنی ہے، بلکہ تکملہ حیاتِ شبلی ہے'۔ [۲۴]

اگرچہ منشی محمد امین زبیری نے اس تالیف کو حیاتِ شبلی کا "تکملہ" قرار دیا، لیکن ان کا انداز بہت جارحانہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ترتیبِ زمانی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے پسند کے نتائج برآمد کیے۔ خطوطِ شبلی کے بارے میں یہ کہہ کر کہ 'ان میں کوئی بات اور کوئی چیز ایسی نہیں، جو اخلاقی ابتذال کہی جاسکے'، لکھتے ہیں کہ 'اس مجموعۂ خطوط کی اشاعت کے بعد ہی مکاتیبِ شبلی کو بہت سے مکاتیب کے اضافوں کے ساتھ علامہ سید سلیمان نے ایک مقدمہ لکھ کر دو حصوں میں شائع کیا'۔ [۲۵]

---

[۲۲] ماخذ سابق، ص ۲۹۔

[۲۳] جمیل نقوی (مرتب): شبلی کی رنگین زندگی، مصنفہ منشی محمد امین زبیری، فاروق عمر پبلشرز، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۶۔

[۲۴] منشی محمد امین زبیری: شبلی کی رنگین زندگی، مرتبہ جمیل نقوی، ص ۴۹۔

[۲۵] ماخذ سابق، ص ۹-۱۰۔

حالانکہ مکاتیبِ شبلی کی جلد اوّل ۱۹۱۶ء اور جلد دوم ۱۹۱۷ء میں شائع ہو چکی تھی، جب کہ خطوطِ شبلی کی اشاعت ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ مہدی حسن افادی، ابوالکلام آزاد اور بعض تلامذہ کے نام خطوں کے مندرجات سے متعلق ان کے جملوں کی کاٹ ملاحظہ کیجیے:

'ان میں مولانا اتنے کھل کھیلے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے'۔

'ابوالکلام آزاد کے نام کے مکاتیب نے تو انھیں بالکل عریاں کر دیا ہے'۔

'مولانا شبلی علمی رفعت وبلندی سے اخلاقی ابتذال کی پست سطح پر آجاتے ہیں'۔[۲۶]

شبلی سے متعلق منشی محمد امین زبیری کی رنجیدگی کے اسباب جاننے کے لیے زیرِ نظر کتاب میں حیاتِ شبلی پر ان کا درج ذیل تبصرہ بہت مفید ہو سکتا ہے۔ زبیری صاحب لکھتے ہیں:

جب تنقیدی نظر سے ہم اس کتاب کو پڑھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ علامہ مرتب نے متذکرہ اصولِ سوانح نگاری سے دانستہ اعراض کیا ہے۔ بیشتر رطب ویابس روایات پر واقعات کے ہوائی قلعے بنائے اور دوسروں پر گولہ باری کی ہے۔ واقعات کی تخلیق، ان کا اخفا، حق وباطل کی تلبیس، مبالغہ، تبختر، رکاکتِ بیان، علی گڑھ تحریک اور سرسید کی تنقیص وحقارت اور افترائیات کا ایک طومار ہے اور طرہ یہ ہے کہ خطوطِ شبلی کو، جو مکاتیبِ شبلی سے ایک علٰحدہ مجموعہ ہے اور صرف دو بیگمات (عطیہ بیگم فیضی وزہرا بیگم فیضی) کے نام ہیں، قطعی نظر انداز کر دیا۔[۲۷]

خطوطِ شبلی کو نظر انداز کرنا اور علی گڑھ اور سرسید کی مخالفت بنیادی سبب قرار پاتے ہیں شبلی کی مخالفت کے۔ اس سلسلے میں زبیری صاحب کا ایک اور بیان بھی قابلِ ذکر ہے۔ ۱۹۳۶ء-۱۹۳۷ء میں کانگریس کی طرف سے مسلم عوام سے رابطہ کرنے اور مسلم لیگ کی قوت توڑنے کی مہم شروع ہوئی تو ابوالکلام آزاد نے بھرپور کردار ادا کیا۔ زبیری صاحب کے خیال میں اگرچہ وہ ناکام رہے تاہم ۱۹۴۰ء میں انھیں کانگریس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ دارالمصنّفین اور ان کے رفقا سے قریبی تعلق کی بنا پر یہ اعزاز اس ادارے کے لیے باعثِ فخر تھا۔ زبیری صاحب لکھتے ہیں:

اسی زمانے میں حیاتِ شبلی مرتب ہو رہی تھی۔ اس میں اتحادِ اسلامی اور کانگریس کی ہمرہی کو شبلی کا فیض صحبت تو دِکھایا، مگر مسلم انڈیا کے اعتماد قطعی زائل ہونے اور ان [ابوالکلام آزاد] کو

---

(۲۶) ماخذ سابق، ص ۱۰۔

(۲۷) ماخذ سابق، ص ۱۳۱۔

شوبوائے سمجھے جانے کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔[۲۸]

متذکرہ بالا تمام الزامات سید سلیمان ندوی پر عائد کیے گئے ہیں اور موجبِ سزا شبلی ٹھہرے، اس سے منشی محمد امین زبیری کی علمی دیانت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

***

شبلی کی حیاتِ معاشقہ کے مصنف وحید قریشی، صلاح الدین صاحب کے بھی شکر گزار ہیں 'جو محترمہ عطیہ بیگم سے ایک ایسا مضمون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے بغیر یہ موضوع یقیناً تشنہ رہ جاتا'۔[۲۹] عطیہ فیضی کا یہ مضمون 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی' کے عنوان سے ادبی دنیا (جولائی، اگست ۱۹۴۶ء) میں شائع ہوا۔ یاد رہے کہ ۱۹۲۲ء-۱۹۲۳ء میں عطیہ نے مدیرِ ظلّ السلطان کے مدیر محمد امین زبیری کو شبلی کے خطوط دِکھائے اور انھیں رسالے میں اشاعت کی اجازت دے دی، بعد ازاں یہ خطوط ایک مجموعے کی صورت میں شائع ہوئے، وہ لکھتی ہیں:

> اس واقعہ کو سالہاسال ہو گئے، مگر اب تھوڑا عرصہ ہوا، جب میرے علم میں آیا کہ اُسی زمانے میں مولانا شبلی کے شاگرد اور جانشین سید سلیمان ندوی نے بھی ان کے خطوط کا ایک مجموعہ مکاتیبِ شبلی کے نام سے شائع کیا تھا اور اس میں بعض خطوط ایسے بھی شائع کیے، جن سے ہمارے نام کے خطوط کے ساتھ رابطہ اور سلسلہ ہے اور میری ذات اور شخصیت کے متعلق اشارے ہیں۔ ان سے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کو بھی ایک بڑا مواد اور مشغلہ ہاتھ آ گیا ہے۔ ریڈیو پر تقریر ہوئی اور اردو رسائل میں مضامین شائع کیے گئے، اگرچہ ہمارے خطوں میں تو کوئی بات ایسی نہ تھی۔[۳۰]

ان بیانات پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ مکاتیبِ شبلی ۱۹۱۶ء-۱۹۱۷ء میں شائع ہوتے ہیں، جن میں عطیہ کی 'ذات اور شخصیت کے متعلق اشارے' ہیں، لیکن حیاتِ شبلی کی اشاعت تک عطیہ سے متعلق کسی ادیب یا افسانہ نگار کے ہاتھ نہ تو کوئی 'مواد' آتا ہے اور نہ کوئی 'مشغلہ'۔ عطیہ فیضی، شبلی کے خطوط کے جن مندرجات کو اپنی ذات اور شخصیت کے متعلق 'اشارے' قرار دیتی ہیں، اگر وہ اتنے ہی تشویش ناک ہوتے تو اس طویل عرصے (۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۶ء) میں ان کی بھنک عطیہ

---

[۲۸] ماخذ سابق، ص ۸۷-۸۸۔

[۲۹] وحید قریشی: شبلی کی حیاتِ معاشقہ، ص ۱۲۔

[۳۰] عطیہ فیضی: 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی'، بحوالہ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، ص ۲۷۴۔

کے کانوں میں ضرور پڑتی۔ مکاتیبِ شبلی کے بارے میں عطیہ کا یہ کہنا بھی کافی دلچسپ ہے کہ 'ابھی [۱۹۴۶ء میں] تھوڑا عرصہ ہوا، جب میرے علم میں آیا'۔ دوسری جانب، اگر ان مکاتیب میں عطیہ کی ذات اور شخصیت کے متعلق 'اشارے' تھے تو اس کی جستجو عطیہ نے نہیں، محمد امین زبیری نے کی اور عطیہ نے بھی کمال مہربانی سے اپنے نام شبلی کے خطوط برائے اشاعت ان کے حوالے کر دیے۔ یہ خط پہلے ظلّ السلطان میں شائع ہوئے اور پھر کتابی صورت (خطوطِ شبلی) میں منظر عام پر آئے، لیکن حیرت ہے کہ ادبی دنیا میں اس پر بھی کوئی قابلِ ذکر ہلچل نہیں ہوتی؛ ورنہ تو یہی دو مواقع تھے، جب ادیبوں اور افسانہ نگاروں کے ہاتھ کوئی بات آسکتی تھی، لیکن ان دونوں مواقع سے نہ کسی نے فائدہ اٹھایا اور نہ ہی اپنی شہرت کا سامان کیا۔ شبلی کے خط تو شائع ہو گئے، جن سے معلوم ہو گیا کہ ان میں کون کون سے 'اشارے' ہیں، لیکن عطیہ کے خطوط کے پردۂ اخفا میں چلے جانے کے بعد ان 'اشاروں' کا سبب معلوم نہ ہو سکا، چنانچہ ان کا یہ بیان تحقیق طلب رہ جاتا ہے کہ 'ہمارے خطوں میں تو کوئی بات ایسی نہ تھی'۔ عطیہ معترض ہیں:

> مولانا ایک شریف گھر میں ایک عالم، ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح جاتے ہیں۔ یہاں بڑی عزت سے ان کا استقبال ہوتا ہے، لیکن ان کے دل میں اَور ہی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، جن کو ایسے راز دار دوستوں کے خطوں میں بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں، جو مہذب، تعلیم یافتہ اور عالم بھی ہیں اور یہ بزرگ ان خطوں کو اشاعت کے لیے نذر کر دیتے ہیں اور ان کے جانشین بھی، جو علم و اخلاق اور ادب کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتے ہیں، ان کو شائع کرتے ہیں اور یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس طرح وہ لائبل [۳۱] کے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ کیا اسی معیارِ شرافت پر ان عالموں اور فاضلوں کو ناز ہے؟ [۳۲]

اگر شبلی کے 'دل میں اور ہی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں'، جنھیں وہ 'راز دار دوستوں کے خطوں میں بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں' تو اس سے عطیہ بے خبر نہ تھیں، بلکہ شبلی انھیں بھی مطلع کرتے رہتے تھے۔ ۹/ جون ۱۹۰۹ء کے خط میں لکھتے ہیں، 'اب تو تمھارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سناتا ہوں اور لوگ سر دھنتے ہیں'۔ [۳۳] ۱۳/ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو بتاتے ہیں، 'میرے

---

[۳۱] لائبل Libel یعنی مطبوعہ مواد میں قذف، غلط الزام تراشی۔

[۳۲] ماخذ سابق، ص ۲۷۴-۲۷۵۔

[۳۳] شبلی نعمانی بنام عطیہ فیضی، مرقومہ ۹/ جون ۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، ص ۵۲۔

خاندان کی عورتیں... تم سے بڑے شوق سے ملتیں، کیونکہ تمھارا اکثر تذکرہ میری زبان سے سنتی رہتی ہیں'،[۴۴] حتیٰ کہ ۱۵/ جولائی ۱۹۰۹ء کے ایک خط میں رقم طراز ہیں، 'میری لڑکی علاج کے لیے آئی ہے، وہ تمھارے خط پڑھ کر سخت حیرت زدہ ہوتی ہے کہ اس قابلیت کی بھی عورتیں ہوتی ہیں'۔[۴۵] جن کے دل میں 'اور ہی جذبات' ہوتے ہیں اور کسی کو 'مزے لے کر' سناتے ہیں تو وہ مکتوب الیہ کو نہیں بتاتے اور نہ ہی اس بات کا خاندان کی عورتوں یا بیٹی کے سامنے ذکر کرتے ہیں۔

عطیہ کا یہ بیان بھی توجہ طلب ہے:

> ہم نے مولانا کے خطوں کو، جو ہمارے نام آتے تھے، ہمیشہ معصومانہ روشنی میں دیکھا، کیونکہ ان میں بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی قسم کی بدگمانی کرتا یا کسی برائی کا احساس ہوتا، البتہ بعض نظموں میں شوخی ضرور ہوتی تھی، جو شاعرانہ طبیعت کا خاصہ ہے؛ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ راز و اشارات اُن ہی جذبات پر مبنی تھے اور بعض نظموں میں بھی ان کو شاعری کے پردے پر ظاہر کرتے تھے۔ انسان کے علم کا اندازہ تو ایک دِن میں ہو جاتا ہے، لیکن نفس کی خباثت برسوں میں بھی نہیں معلوم ہوتی اور ہم بھی اسی علم و لاعلمی میں رہے۔[۳۶]

عطیہ کے ان بیانات پر وحید قریشی نے نہایت دلچسپ نوٹ لکھا ہے:

> اس اقتباس میں دلائل سے زیادہ جذبات کا استعمال ہوا ہے اور مولانا شبلی کی ذات پر بعض نازیبا اور ناواجب حملے کیے گئے ہیں۔ شبلی جذباتی آدمی ضرور تھے، لیکن 'خبیث' نہیں۔... متذکرہ بالا اقتباس میں لاعلمی پر جو ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے، ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور ہم علامہ شبلی اور علامہ اقبال کے ان جملوں کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں، جن میں عطیہ صاحبہ کو ذہین و فطین کہا گیا ہے۔[۳۷]

واضح رہے کہ ۱۹۰۸ء میں دستۂ گُل، ۱۹۰۹ء میں بُوے گُل، ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں مکاتیبِ شبلی اور ۱۹۲۶ء میں خطوطِ شبلی کی اشاعتوں کے باوجود موضوعِ زیرِ بحث پر کسی طرف سے کوئی سوال نہیں اُٹھایا گیا، لیکن ۱۹۴۳ء میں حیاتِ شبلی شائع ہونے کے فوراً بعد عطیہ سے متعلق گفتگو کا آغاز

---

[۴۴] شبلی نعمانی بنام عطیہ فیضی، مرقومہ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۱۰ء، خطوطِ شبلی، ص ۷۷۔

[۴۵] شبلی نعمانی بنام عطیہ فیضی، مرقومہ ۱۵/ جولائی ۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، ص ۶۱۔

[۳۶] عطیہ فیضی: 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی' بحوالہ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، ص ۲۷۵۔

[۳۷] وحید قریشی: شبلی کی حیاتِ معاشقہ، ص ۹۱- ۹۲۔

ہوگیا۔ اس بحث کا آغاز محمد امین زبیری سے ہوتا ہے، جن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عطیہ لکھتی ہیں کہ 'انھوں نے ہماری پوزیشن کو تبصرۂ حیاتِ شبلی میں بیان کرکے صاف کر دیا اور دنیا کو اصل حقیقت بتا دی'۔[۳۸] کیا اندازِ تحسین ہے! یہ وہی امین زبیری ہیں جنھیں نہ تو مکاتیبِ شبلی میں عطیہ کی ذات اور شخصیت کے متعلق 'اشاروں' سے کوئی اذیت پہنچی اور نہ ہی خطوطِ شبلی شائع کرتے ہوئے انھیں کچھ ملال ہوا، ملال ہوا تو اُس وقت جب حیاتِ شبلی منظر عام پر آئی۔

***

ابھی وحید قریشی کے 'خیالاتِ عالیہ' پر بحث جاری تھی کہ شیخ محمد اکرام کی "شبلی نامہ" منظر عام پر آگئی۔ انھوں نے دس باب باندھے، جن میں سے چند ایک موضوعِ زیرِ بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے باب 'علی گڑھ' کے ابتدائی حصے میں علی گڑھ کالج میں آمد، سرسید سے شبلی کے تعلقات، کالج میں شبلی کے شب و روز، شبلی کی قدیم اور کالج کی جدید تعلیم کے ان پر اثرات اور کالج کی درس و تدریس سے تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکالنے جیسے معاملات پر سیر حاصل گفتگو کے بعد انھوں نے سید سلیمان ندوی کے بعض بیانات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے؛ یعنی 'سرسید اپنے ہم نشینوں سے آمنّا و صدّقنا کے سوا کوئی اختلافِ رائے برداشت نہیں کرتے تھے'،[۳۹] 'سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر بات میں انگریز ہو جائیں'[۴۰] یا 'اخیر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے'[۴۱] وغیرہ وغیرہ۔ شیخ اکرام لکھتے ہیں کہ انھوں [سلیمان ندوی] نے سرسید کی جو بھونڈی اور خلافِ واقعہ تصویر کھینچ کر بچارے شبلی کی مخالفت کا سامان کیا ہے، وہ شبلی کے دل و دماغ کی نہیں۔[۴۲]

سید سلیمان ندوی کے ان خیالات پر کہیں تو شیخ محمد اکرام نے وضاحتیں پیش کیں اور کہیں کہیں طنزیہ انداز اختیار کیا۔ یہاں دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ شیخ صاحب کے اندازِ اسلوب کو

---

[۳۸] عطیہ فیضی: 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی' بحوالہ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، ص ۲۷۵۔

[۳۹] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۲۳۵۔

[۴۰] ماخذ سابق، ص ۲۴۱۔

[۴۱] ماخذ سابق، ص ۲۴۲۔

[۴۲] شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، ص ۹۱۔

محسوس کیا جا سکے، لکھتے ہیں:

سید سلیمان ندوی نے شبلی کے خطوط، مضامین، اشعار مرتب کیے ہیں۔ ان چیزوں کو مرتب کرتے ہوئے انھوں نے بہت سی قابلِ اعتراض باتوں پر سیاہی پھیر دی ہے، لیکن عقیدت مند آنکھوں کو قابلِ اعتراض باتیں مشکل سے ہی نظر آتی ہیں اور سید سلیمان ندوی کی احتسابی کارفرمائی کے بعد اب ان چیزوں کا یہ عالم ہے کہ آپ شبلی کی شخصیت کے خلاف کوئی فردِ جرم مرتب کرنا چاہیں تو آپ کو شبلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تائیدی دستاویزات مل جائیں گی۔ اپنے استاد پر یہ احسان کر کے اور حیاتِ شبلی میں بھی بعض ایسے رخنے چھوڑ کر، جن سے شبلی کی اصل شخصیت پر تھوڑی بہت نئی روشنی پڑ جاتی ہے، سید سلیمان اب اسے اپنے استاد کی خیر خواہی سمجھتے ہیں کہ ہر اس شخص کا منہ چڑائیں، جس کا قد و قامت شبلی سے بلند ہے۔[۴۳]

شبلی کو سرسید سے لاکھ اختلاف سہی، لیکن سرسید کی نسبت ان کی وہ گری ہوئی رائے ہر گز نہ تھی، جو سید سلیمان کی ہے؛ جنھیں سرسید کو قریب سے دیکھنے کا کوئی موقع نہیں ملا، یا اُن لوگوں کی ہے، جو حقیقی واقعات سے بے خبر ہیں۔ آپ سرسید کے اس کارٹون کو دیکھیے، جو سید سلیمان نے حیاتِ شبلی میں پیش کیا ہے اور اس کا شبلی کی اُس تصویر سے مقابلہ کیجیے، جو شبلی نے اُس وقت کھینچی تھی جب وہ علانیہ سرسید کے خلاف صف آرا تھے۔[۴۴]

یہاں مصنف نے شبلی کے مضمون 'مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ' سے ایک اقتباس پیش کیا ہے، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ شبلی آخر عمر تک سرسید کی عظمت اور بلندیِ کردار کا ذکر برسرِ محفل کرتے رہے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ مضمون مسلم گزٹ لکھنؤ میں ۱۲/ فروری ۱۹۱۲ء، ۴/ مارچ ۱۹۱۲ء اور ۹/ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے شماروں میں شائع ہوا۔ یہی مضمون ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ کے شمارے جولائی ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا اور اَب مقالاتِ شبلی جلد ہشتم میں شامل ہے۔ درج ذیل اقتباس یہیں سے نقل کیا جا رہا ہے۔ شبلی لکھتے ہیں:

وہ پُرزور دست و قلم، جس نے اسبابِ بغاوتِ ہند لکھا تھا اور اُس وقت لکھا تھا، جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے۔ وہ بہادر، جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اُڑادی تھیں اور جو کچھ اُس نے ان تین آرٹکلوں میں لکھا، کانگریس کا لٹریچر

---

[۴۳] ماخذ سابق، ص ۹۰-۹۱۔

[۴۴] ماخذ سابق، ص ۹۱-۹۲۔

حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پرزور لٹریچر نہیں پیدا کر سکتا۔ وہ جاں باز، جو آگرہ کے دربار سے اس لیے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں۔[۴۵]

شیخ محمد اکرام نے دوسری گرفت عطیہ فیضی کے حوالے سے کی ہے۔ ان کے خیال میں 'منتشر خطوط اور مبہم اشعار کی بنا پر کسی کی داستانِ دل مرتب کرنا آسان نہیں، لیکن جب فریقین میں سے ایک شبلی کی سی قومی اہمیت رکھتا ہو اور دوسرا پرائیویٹ خطوط کو اشاعت کے لیے حوالے کر دے تو پھر اس داستان کی ترتیب ناگزیز سی ہو جاتی ہے'۔[۴۶] شیخ اکرام خطوطِ شبلی، شبلی کی حیاتِ معاشقہ اور شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق کا ذکر کرتے ہوئے خطوطِ شبلی اور غزلیاتِ بمبئی کو ایک لڑی میں پرونے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں 'ان تحریروں میں غلطی اور غلط فہمی کی گنجائش ہے'،[۴۷] لیکن عطیہ کے مضمون 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی' نے اس مسئلے کو حل کر دیا۔ شیخ صاحب کی طرف سے عطیہ کے اس بیان کو کہ 'مولانا ایک شریف گھر میں ایک عالم، ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح جاتے ہیں، جہاں بڑی عزت سے ان کا استقبال ہوتا ہے، لیکن ان کے دل میں اَور ہی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں'،[۴۸] بغیر کسی تامل و تردّد کے درست مان لینے کا مشورہ ان کی جانب داری کا اظہار ہے۔ ان کا یہ خیال بھی ان کے تعصب کو ظاہر کرتا ہے کہ 'اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس آگ کو شعلہ زن رکھنے کی عطیہ بیگم صاحبہ نے کوئی بھی کوشش کی تھی'۔[۴۹] گویا وہ عطیہ کے خطوط کی عدم موجودگی میں محض قیاس کی بنیاد پر عطیہ کی معصومیت پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں اور شبلی کے 'زود اشتعال' جذبات کے بھڑک اٹھنے کی اطلاع بہم پہنچاتے ہیں۔

وحید قریشی نے عطیہ کی پیدائش کو ۱۸۹۲ء سے ڈیڑھ دو سال قبل کا واقعہ قرار دیا، جس کے

---

[۴۵] شبلی نعمانی: مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۱۔

[۴۶] شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، ص ۱۵۴، حاشیہ ا۔

[۴۷] ماخذ سابق۔

[۴۸] عطیہ فیضی: 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی'، بحوالہ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، ص ۲۷۴-۲۷۵۔

[۴۹] شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، ص ۱۵۵، حاشیہ۔

مطابق عطیہ اور شبلی کی ملاقات کے وقت (۱۹۰۶ء میں) دونوں کی عمریں بالترتیب سولہ اور انچاس برس قرار پاتی ہیں، دوسری جانب شیخ محمد اکرام عطیہ کی عمر بیس سال سمجھتے ہیں، چنانچہ ان کے خیال میں 'مولانا کو اس قابل باکمال بست سالہ لڑکی نے جس طرح مسحور و بیخود بنا دیا تھا، اس کا اندازہ خطوطِ شبلی کے صفحے صفحے سے ہوتا ہے'۔[۵۰] حیرت ہے کہ ۱۹۷۱ء میں یادگارِ شبلی لکھتے وقت بھی وہ عطیہ (پ: ۱۸۷۷ء) کی عمر کا درست تعین نہ کرسکے اور اس میں یہی جملہ دہرا دیا،[۵۱] یہی وجہ ہے کہ انھوں نے 'شبلی اور عطیہ میں شاید تیس سال کا فرق' محسوس کیا۔[۵۲]

شیخ اکرام ایک طرف وحید قریشی کے بعض خیالات کی تردید کرتے ہیں تو دوسری جانب خود بھی قیاس آرائی سے کام لیتے ہوئے اپنی مرضی کے نتائج نکالتے ہیں:

> خطوطِ شبلی کے ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ دستۂ گُل کی بعض غزلیں اسی نشے کا اثر تھیں، جس نے خطوطِ شبلی کو ایک خم کدۂ محبت بنا دیا ہے، لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ کون سی غزل کس لمحے کی یادگار ہے اور اس میں کس واقعے کی طرف اشارہ ہے، آسان نہیں۔ یہ تو ایسا کام ہے، جسے اگر 'عالم السرائر' مولانا ابوالکلام آزاد (جو بمبئی کی بعض رنگین صحبتوں میں شبلی کے شریک تھے) چاہیں تو بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں اور دل دادگانِ شبلی کو ممنونِ کرم کرسکتے ہیں۔[۵۳]

اس اقتباس میں قیاس آرائی اور مزے لینے کی کیفیت دونوں پائی جاتی ہیں۔ یہ انداز تحقیقی اصولوں کے سراسر منافی ہے۔ استخراجِ نتائج کے لیے قیاس آرائی، طنزیہ لب ولہجہ اور لذت پسندی سود مند نہیں ہوسکتے۔ اس موقع پر وہ عطیہ فیضی، بیگم مہدی افادی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے خوب 'دادِ تحقیق' دیتے ہیں، لیکن اگلے ہی باب 'ندوۃ العلما لکھنؤ' کے پہلے پیراگراف میں شبلی کے یہاں معاملات کے توازن اور اعتدال کا اور جذباتی کیفیات پر قومی اور مذہبی فرائض کو ترجیح دینے کا اعتراف بھی کرتے ہیں:

> بمبئی اور کلکتہ کی دلچسپیاں شبلی کے لیے بلا کی کشش رکھتی تھیں، لیکن ندوہ کی کشش اس سے زیادہ تھی۔ شبلی کو اگر عطیہ اور زہرا کی صحبت اور بمبئی اور کلکتہ کے خوش نما مناظر سے تعلق

---

(۵۰) ماخذ سابق، ص ۱۵۴۔

(۵۱) شیخ محمد اکرام: یادگارِ شبلی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع دوم ۱۹۹۴ء، ص ۳۳۳۔

(۵۲) ماخذ سابق، ص ۳۴۱۔

(۵۳) شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، ص ۱۶۲۔

خاطر تھا تو اس مجموعۂ اضداد کو اپنی قوم اور مذہب اور اپنے علمی و ادبی مشغلے ان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ وہ بمبئی یا جزیرہ جاتے، تب بھی ان کا معمول تھا کہ اپنے عزیز اور حسین میزبانوں سے اُس وقت ملتے، جب صبح صبح اپنے وظیفۂ علمی سے فارغ ہو جاتے، چنانچہ شبلی کی رنگین دلچسپیوں سے ان کے قومی کاموں میں کوئی فرق نہ آیا، بلکہ ان کی سب سے زیادہ قومی مصروفیت کے یہی دِن تھے۔[۵۴]

جیسا کہ ایک وقت پر وحید قریشی نے اپنے نتائجِ تحقیق سے سرد مہری ظاہر کر دی، اسی طرح شیخ محمد اکرام نے شبلی نامہ کے دوسرے ایڈیشن یادگارِ شبلی میں 'خطوطِ شبلی کی صحیح تعبیر' پیش کرتے ہوئے اپنے خیالات پر نظر ثانی کر لی۔ ذیل میں شیخ صاحب کے مذکورہ بیان سے منتخب حصے پیش کیے جاتے ہیں:

> عطیہ بیگم سے شبلی کو جو تعلق خاطر تھا، اگر یہ خیال کیا جائے کہ ان جذبات کی نوعیت ایک 'گناہ' کی تھی، جس کا 'ستر' چاہیے تو ہمیں اس سے اختلاف ہے۔... شبلی نے عطیہ کی نسبت اپنی رائے کو 'گناہ' نہیں سمجھا اور نہ ہی اس پر 'پردہ' ڈالنے کی بڑی کوشش کی۔... عطیہ سے مراسم قدیم طرز کی ثقہ ہستیوں کو ناپسند ہوں گے، لیکن شبلی قدیم طرز کی ایک ثقہ ہستی نہ تھے، پھر ان میں 'گناہ' کے اصل مفہوم والی کوئی بات نہ تھی۔... عطیہ بیگم سے شبلی نے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں، اس میں ان کی طبعی رومانیت کو بھی دخل تھا، لیکن یہ بھی انصاف نہیں کہ اس دل بستگی کے علمی اور اصلاحی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے۔... اس میں غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کی قدر، ہمت اور اولوالعزمی کے لیے احترام، پولیٹیکل خیالات سے اتفاق رائے، یہ سب باتیں شامل تھیں اور ان سب کے پس پشت یہ ارمان کہ ان کے ایک کرم فرما کی بیٹی، جس کے خاندان میں پردے کا رواج نہیں، 'ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرر بن جائیں، جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں' اور اب جو 'وہ میدان میں آچکیں، جو کچھ ہو، کمال کے درجہ پر ہو'۔ شبلی اس جذبے کو گناہ نہیں سمجھتے تھے، سوائے معاندین یا خاص اہلِ احتساب کے، اس پر پردہ نہ ڈالتے تھے۔ ان کے دل میں کوئی چور نہ تھا۔[۵۵]

***

---

[۵۴] ماخذ سابق، ص ۱۷۸۔

[۵۵] شیخ محمد اکرام: یادگارِ شبلی، ص ۳۴۳-۳۴۵۔

علامہ شبلی کی رحلت کے بعد شبلی شکنی کی تمام تر ذمہ داری علی گڑھ کے تعلیم یافتہ مولوی عبدالحق نے سنبھال رکھی تھی۔ ان کے ساتھ ساتھ مولانا وحید الدین سلیم کی بھی بعض تحریریں شامل ہیں، جو سرسید کی زندگی کے آخری پانچ سالوں میں ان کے لٹریری سیکریٹری رہے؛ لیکن یہ بھی ہے کہ اس پورے دَورانیے (۱۹۱۴-۱۹۴۳ء) میں مولوی صاحب کے 'ارشادات' کا نوٹس نہیں لیا گیا، لیکن حیاتِ شبلی کا منصۂ شہود پر آنا تھا کہ صرف ایک سال (۱۹۴۶ء) میں شبلی کی مخالفت میں چھوٹی بڑی تین کتابیں شائع ہو جاتی ہیں اور یہ سلسلہ ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۲ء اور ۱۹۷۱ء تک چلتا رہتا ہے۔

دیکھا جائے تو شبلی کی مخالفت میں خود شبلی کا قصور محض "حیاتِ جاوید" پر چند الفاظ پر مبنی تنقید ہے، اس کے علاوہ انھیں جن جرائم میں کٹہرے میں کھڑا کیا گیا، ان میں وہ خود مطلوب نہ تھے، بلکہ ان کو 'مجرم' ثابت کرنے میں ان کے ممدوح (سید سلیمان ندوی) کے قلم کی کرامات تھیں۔

عطیہ کے نام شبلی کے خطوط کی ۱۹۲۶ء میں اشاعت کے وقت اس کے مرتب نے شبلی پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور نہ ہی ان کا ذہن خطوط کے مندرجات سے شبلی کی کسی قلبی یا باطنی برائی کی طرف منتقل ہوا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس مجموعے کے منظر عام پر آنے سے ۱۹۴۳ء تک کسی اور کی نظر بھی ان 'برائیوں' پر نہیں پڑی؛ چنانچہ شبلی شکنی میں ان مراسلات کو بنیادی کردار نہیں سمجھا جا سکتا۔ یوں حیاتِ شبلی کی اشاعت ہی وہ سنگ میل ہے، جہاں سے شبلی پر تنقیص کا آغاز ہوتا ہے؛ گویا سید سلیمان ندوی کی طرف سے علی گڑھ اور سرسید کے متعلق شبلی کے خیالات کی ترتیب ہی اصل وجہِ تنازع قرار پاتی ہے۔ سید سلیمان ندوی کو اس کشمکش کو ابھارنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ذیل میں اس کی چند وجوہ اور ان کا تجزیہ کرتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے:

(۱) مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاتھ پر سید سلیمان ندوی کی بیعت۔

(۲) علی گڑھ اور سرسید کو دیوبند کے نقطۂ نظر سے دیکھنا۔

(۳) علی گڑھ کا تحریک پاکستان اور اعظم گڑھ کا متحدہ قومیت کی طرف میلان۔

(۴) علی گڑھ اور سرسید سے شبلی کے اختلافات... سید سلیمان ندوی کے بجائے اقبال احمد خاں سہیل کی اختراع۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی زندگی میں، بقول سید صباح الدین عبد الرحمن، ۱۹۴۰ء میں ایک بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوا... اپنی دینی عظمت و علمی جلالت کا لحاظ کیے بغیر انہوں نے حضرت مولانا

(اشرف علی) تھانوی کے آستانے پر جا کر اپنا سرِ نیاز جھکا دیا۔[۵۶] اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے اس بیعت پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی سے کہا: 'آپ نے سیرت النبیؐ کو بہشتی زیور کے قدموں میں ڈال دیا ہے'۔ سید صاحب مسکراتے ہوئے بولے: 'آپ ہماری عمر کو پہنچیں گے تو آپ بھی یہی کریں گے'۔ مولانا حنیف ندوی نے برجستہ جواب دیا: 'میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ پر عمر کا اثر ہے'۔[۵۷] اتفاق دیکھیے کہ اسی سال سید سلیمان ندوی کو سوانحِ شبلی لکھنے کا خیال آیا۔ حیاتِ شبلی کے دیباچے میں اس تالیف کی ابتدا کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ...یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء آ گیا، یعنی مولانا کی وفات اور دارالمصنّفین کی بنیاد پر پچیس چھبیس برس گزر گئے۔ احباب کا تقاضا ہوا کہ دارالمصنّفین کی پچیس برس کی سلور جوبلی منائی جائے۔ میرا اصول یہ ہے کہ... 'نمی رویم بہ راہے کہ کارواں رفتست'۔ اس پامال رسم کو چھوڑ کر یہ خیال آیا کہ اس جوبلی کی یادگار میں خود موضوعِ جوبلی، یعنی مولانا شبلی کی سوانح عمری کا وہ کام کیوں نہ انجام دے دیا جائے جو سالہاسال سے فرصت کے انتظار میں پڑا ہے، چنانچہ بسم اللہ کر کے ۱۹۴۰ء میں اس کا آغاز کر دیا؛ آخر تین برس کی محنت میں ۱۹۴۲ء میں یہ انجام کو پہنچا۔[۵۸]

گویا مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاتھ پر بیعت اور حیاتِ شبلی کا آغاز ایک سال (۱۹۴۰ء) کے واقعات ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر ابراہیم ڈار نے شیخ محمد اکرام کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

> مولانا شبلی کی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ سید سلیمان صاحب نے ان کے سوانحِ حیات اُس وقت قلم بند کیے، جب وہ تھانوی عقیدتمندوں کے زمرے میں داخل ہو چکے تھے، اس لیے ان کی اطاعت ووفاداری شبلی اور اشرف علی کے درمیان بٹ گئی ہے۔[۵۹]

---

[۵۶] سید صباح الدین عبدالرحمن: مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۲۴۔

[۵۷] http://paighamstudios.blogspot.com/2011_03_01_archive.html بتاریخ ۱۵ اگست ۲۰۱۵ء۔

[۵۸] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۵۔

[۵۹] پروفیسر ابراہیم ڈار بنام شیخ محمد اکرام، بحوالہ یادگارِ شبلی، ص ۸۔

شبلی کی ذات سے علامہ سید سلیمان کو جو نسبت تھی، اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ان کی سوانح عمری لکھتے اور اس محبت سے کہ اس پر اضافہ ممکن نہ رہتا۔ حقیقت بھی یہی کہ حیاتِ شبلی پر ہر طرح کے اعتراضات کے باوجود بیاسی برس بعد بھی شبلی کی کوئی اور سوانح عمری اس پایے کی نہ لکھی جا سکی۔ لیکن جو نسبت انھوں نے تھانوی صاحب سے قائم کی، اس کے تقاضوں کو بھی غالباً وہ نظر انداز نہ کر سکے اور شبلی کے علی گڑھ اور سرسید سے تعلقات کو دیوبند اور اشرف علی تھانوی کے نقطۂ نظر سے جانچنے لگے۔ یہ بات مفروضہ بھی ہو سکتی ہے، تاہم پروفیسر ابراہیم ڈار کا خیال ہے کہ 'مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد سید صاحب کے نقطۂ نظر میں ایک غیر معمولی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے'۔[۶۰] البتہ شیخ محمد اکرام اس پس منظر کو تسلیم کرنے کے باوجود مختلف زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں:

> سید صاحب نے علامہ شبلی کے عقلی و اصلاحی کارناموں پر جو نسبتاً کم توجہ دی ہے، اس میں بھی ان کے نئے رجحانات کو دخل ہو گا (جس سے اعظم گڑھ کے بھی کئی رفقا اختلاف رکھتے تھے) اور سرسید سے بڑھتے ہوئے بُعد میں بھی ان میلانات کا اثر ہو گا، لیکن ہمارا خیال ہے کہ سرسید کی نسبت سید سلیمان کے نئے نقطۂ نظر میں ملک کی بدلی ہوئی سیاسی فضا کو زیادہ دخل تھا۔[۶۱]

شیخ محمد اکرام کے اس خیال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ شبلی کی رحلت کے بعد سے ۱۹۴۰ء تک برّ عظیم کی سیاسی فضا یکسر بدل چکی تھی۔ شبلی کی مطعون مسلم لیگ اب مسلمانانِ ہند کی ترجمان بن چکی تھی اور متحدہ قومیت کے علَم بردار (علامہ محمد اقبال اور محمد علی جناح) تجربات کے بعد ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس بات کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ ہے سرسید کی کانگریس مخالف پالیسی کے نتیجے میں علی گڑھ کی تحریک پاکستان سے وابستگی اور دوسری جانب اعظم گڑھ کا کانگریس کی طرف جھکاؤ، جس کا واضح ثبوت دارالمصنّفین میں کانگریسی رہنماؤں کی مہمان نوازی سے ملتا ہے۔ معارف (سلیمان نمبر) سے ایک اقتباس دیکھیے:

> پنڈت موتی لال نہرو پوربی اضلاع کے دورے میں جب اعظم گڑھ آتے تو ہمیشہ دارالمصنّفین میں ہی ٹھہرتے۔ شبلی منزل ان کا بے تکلف مہمان خانہ تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی ہمیشہ

---

[۶۰] پروفیسر ابراہیم ڈار: مضامینِ ڈار، ص ۲۲۵، بحوالہ یادگارِ شبلی، ص ۸۔

[۶۱] شیخ محمد اکرام: یادگارِ شبلی، ص ۸۔

یہی طریقہ رہا۔ وہ جب بھی اعظم گڑھ آئے، دارالمصنّفین میں ٹھہرے۔[۶۲]

ایسے حالات میں جب یہ معلوم ہو رہا ہو کہ انگریز ہندوستان سے جا رہے ہیں اور جب یہ واضح ہونے لگے کہ آزادی کے بعد ہندوستان پر بلاشرکتِ غیرے کانگریس کی حکومت قائم ہو جائے گی، ایسے میں، شیخ محمد اکرام کے خیال میں، 'صرف ذاتی خیالات ہی کا نہیں، بلکہ ادارے کی اور ایک حد تک قومی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ ادارے کے مورثِ اعلیٰ کا سرسید سے زیادہ سے زیادہ بُعد ثابت کیا جائے'۔[۶۳] صورتِ حال اور بیانِ واقعات کا یہ انداز علی گڑھ میں بیٹھے ہوئے شبلی کے 'محبی' کے لیے یقیناً ناقابلِ برداشت تھا۔

لیکن یہ بات اتنی سادہ نہیں کہ سرسید اور شبلی کے مابین مبینہ اختلافات کے اسی پس منظر پر چپ سادھ لی جائے۔ شبلی کے سوانح و شخصیت کے متعلق سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، عبدالحلیم شرر، خواجہ غلام الثقلین اور حسرت موہانی کے متفرق مضامین کے بعد پہلی باضابطہ کوشش منشی محمد مہدی کا رسالہ تذکرۂ شمس العلما مولانا شبلی ہے، جو ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مولوی عبدالسلام ندوی نے مکاتیبِ شبلی وغیرہ کی مدد سے کچھ صفحات کا مسوّدہ تیار کیا جسے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی اور شبلی کے بعض احباب و تلامذہ نے ملاحظہ کیا۔ سید سلیمان ندوی کے خیال میں 'اس مجموعہ میں زندگی کی روح نظر نہ آئی' تو انھوں نے یہ کاغذات شبلی کے ایک اَور شاگرد مولوی اقبال احمد سہیل کے سپرد کیے، جنھوں نے 'مولوی عبدالسلام صاحب کے مسودے کو گھٹا بڑھا کر اور علی گڑھ کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زورِ قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی'۔[۶۴] بقول سید سلیمان ندوی، یہ مضمون 'سیرتِ شبلی' کے عنوان سے الاصلاح سرائے میر میں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے چھ شماروں میں مسلسل نکلتا رہا؛[۶۵] جب کہ فاران کراچی (اپریل ۱۹۵۸ء) کے مطابق 'سیرتِ شبلی' کا یہ سلسلہ پندرہ قسطوں تک پہنچ گیا تھا'۔[۶۶] ۱۹۷۱ء

---

[۶۲] معارف اعظم گڑھ، مئی جون ۱۹۵۵ء (سید سلیمان ندوی نمبر)، ص ۲۲ بحوالہ شیخ محمد اکرام: یادگارِ شبلی، ص ۹۔

[۶۳] شیخ محمد اکرام: یادگارِ شبلی، ص ۹۔

[۶۴] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۵۔

[۶۵] ماخذ سابق۔

[۶۶] فاران کراچی، اپریل ۱۹۵۸ء، ص ۲۸ بحوالہ شیخ محمد اکرام: یادگارِ شبلی، ص ۱۰۔

میں یادگارِ شبلی کی اشاعت تک یہ اقساط دوبارہ منظر عام پر نہ آئی تھیں، البتہ شیخ محمد اکرام نے اس شک کا اظہار کر دیا تھا کہ 'سرسید اور شبلی کے اختلافات والا مضمون، جس کی وجہ سے حیاتِ شبلی کی اتنی مخالفت ہوئی، بنیادی طور پر سہیل صاحب نے لکھا اور اس کا بیشتر حصہ ان کے اندراجات پر مبنی ہے'۔[۶۷]

شیخ محمد اکرام کا یہ شبہ حقیقت کا رُوپ دھار چکا ہے کیونکہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے ایک نوجوان اسکالر فضل الرحمٰن اصلاحی نے الاصلاح کے شماروں (اکتوبر ۱۹۳۶ء، نومبر تا دسمبر ۱۹۳۶ء، جنوری ۱۹۳۷ء، مارچ تا نومبر ۱۹۳۸ء اور جنوری تا فروری ۱۹۳۹ء) سے پندرہ اقساط کو شبلی صدی (نومبر ۲۰۱۴ء) کے موقع پر سیرتِ شبلی کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ ان کے مطابق، حیاتِ شبلی میں متعدد مقامات پر اس کے پورے کے پورے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔[۶۸]

اس بیان کی تصدیق تو بعد میں کی جائے گی، پہلے اقبال احمد خاں سہیل کی مؤلفہ سیرتِ شبلی سے دو دلچسپ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

> ادھر جوں جوں مولانا کی غیر معمولی صلاحیتوں کے جوہر کھلتے جاتے، سرسید کی گرویدگی بڑھتی جاتی۔ ادھر اسٹیج کے اندر داخلے کے بعد خود مولانا کی نگاہوں سے منظر کا رُعب کم ہوتا گیا۔ اسی طرح سید و شبلی روز بروز ایک دوسرے سے قریب ہو رہے تھے، مگر قرب کے ساتھ کشش اور کشش کے ساتھ کشمکش کا بڑھنا بھی قدرت کا عالم گیر اصول ہے۔ ادھر سرسید کو اپنی پختہ کاری اور جاذبیت پر اعتماد، ادھر علامہ شبلی کو اپنے علمی شرف اور تفوق کا احساس۔ ادھر سمعاً و طاعةً سننے کے لیے حسن طلب کے سیکڑوں اسلوب، ادھر 'دع ماکدر' پر استقامت کے لیے حسن انکار کے ہزار پیرایے۔ ادھر نگاہ سحر فن ایک جوہرِ قابل کو ہمہ تن جذب کر لینے کے لیے بے تاب، ادھر فطرت خود دار کو اپنی انفرادیت برقرار رکھنے پر اصرار۔[۶۹]

یہ پیراگراف سیرتِ شبلی کے اس حصے سے ہے، جہاں 'علی گڑھ میں مولانا کی خدمات' شروع ہونے میں چھ صفحات باقی ہیں؛ گویا واقعات کے بیان سے قبل ہی قاری کا ذہن تیار کیا جا رہا ہے،

---

[۶۷] شیخ محمد اکرام: یادگارِ شبلی، ص ۱۰-۱۱۔

[۶۸] اقبال احمد خاں سہیل، سیرتِ شبلی مرتبہ فضل الرحمٰن اصلاحی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء، ص ۵۔

[۶۹] ماخذ سابق، ص ۴۴۔

چنانچہ پچاس صفحات کے بعد جب 'علی گڑھ سے ترکِ تعلق' پر بات ہوتی ہے تو مؤلف کا درج ذیل بیان قاری کو خود بخود ان کے نقطۂ نظر کے قریب کر دیتا ہے:

> قیامِ تعلق کی طرح ترکِ تعلق کوئی اتفاقیہ واقعہ نہیں تھا، بلکہ مدتوں کی بددِلی، کشمکش اور اصولی و شخصی اختلافات کا نتیجہ تھا، اس لیے کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے اور یہ تفصیل جن واقعات پر مبنی ہے، ان میں سے بعض ایسے نازُک مسائل ہیں، جن کی تعبیریں محض زاویۂ نگاہ کے ذرا سے اختلاف سے بدل سکتی ہیں اور بعض ایسی تلخ حقیقتیں ہیں، جن کا اظہار، ممکن ہے کہ کسی شخص یا طبقے کے خلافِ مزاج ہو، اس لیے تقاضائے مصلحت تو یہی تھا کہ اس ساری یوسف زلیخا کو 'پیرے بود، پسرے دوست گم کرد بازیافت' کے اصول پر چند جملوں میں ختم کر دیا جائے، تاکہ دوست دشمن دونوں خوش رہیں، مگر انصاف بالائے اطاعت است ایک سوانح نگار کو آفریں و نفریں سے بے نیاز ہو کر صرف واقعات کی اصلی اور مکمل تصویر پیش کرنی چاہیے۔ علاوہ بریں ان واقعات کے عینی شاہد ایک ایک کر کے اُٹھتے جا رہے ہیں، اس لیے اَب وقت آ گیا ہے کہ اس علمِ سینہ کو درجِ سفینہ کر دیا جائے، تاکہ آئندہ نسلوں کو ماضی و حال کا ربطِ باہمی سمجھنے میں دُشواری نہ ہو۔[۷۰]

ان دونوں اقتباسات سے علی گڑھ اور سرسید سے متعلق اقبال احمد خاں سہیل کے خیالات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اب یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ کیا سید سلیمان ندوی نقل کے مجرم ہیں یا سرسید اور شبلی کی کشمکش خود ان کی اختراع ہے؟ سیرتِ شبلی سے چند اقتباسات دیکھتے ہیں، تقابلی جائزے کے لیے حیاتِ شبلی سے انھی واقعات کو پیش کیا جاتا ہے:

> علی گڑھ کے رہنے والے ایک ہندو صاحب، جو کافی پڑھے لکھے اور صوفیانہ خیال کے آدمی تھے، اعظم گڑھ میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ انھوں نے سرسید کے مضمون 'الدعا والاستجابہ' کی تردید میں ایک دل نشیں رسالہ شائع کیا، جس پر نواب وقار الملک بہادُر نے نہایت عمدہ ریویو کیا اور اس ریویو کے سلسلے میں اس بات پر اظہارِ افسوس کیا کہ سرسید، جو نہ صرف خود مسلم اور جماعتِ اسلامی کے مسلمہ لیڈر رہیں، بلکہ خانوادۂ رسالت کے چشم و چراغ بھی ہیں؛ وہ تو دعا کو، جو بندہ اور خدا میں ربط کا واحد ذریعہ ہے، غیر ضروری اور فضول بتائیں اور ایک ہندو، جس کو کافر کہا جاتا ہے، ایک اسلامی مسئلے کی حمایت کرے۔ اس رسالے کی قوتِ استدلال اور اندازِ بیان سے بعض لوگوں کو

---

(۷۰) ماخذ سابق، ص ۱۰۱۔

شبہ ہوا کہ دراصل مولانا شبلی اس کے مصنف ہیں۔ اس شبہ کو مزید تقویت اس امر سے پہنچی کہ مصنف اعظم گڑھ میں پوسٹ ماسٹر تھے اور مولانا شبلی کے خاص معتقد۔[۷۱]

علی گڑھ کے ایک ہندو بزرگ، جو اچھے پڑھے لکھے تھے، صوفیانہ خیال کے آدمی تھے، اعظم گڑھ میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ انھوں نے سر سید کے مضمون 'الدعاوالاستجابہ' کی تردید میں ایک دل نشیں رسالہ شائع کیا، جس پر نواب وقار الملک نے نہایت عمدہ ریویو لکھا اور اس ریویو کے سلسلے میں اس پر افسوس کیا کہ سر سید، جو نہ صرف مسلمان اور مسلمانوں کے لیڈر ہیں، بلکہ خانوادۂ رسالت کے چشم و چراغ ہیں؛ وہ تو دعا کو، بندہ اور خدا میں ربط کا واحد ذریعہ ہے، غیر ضروری اور فضول بتائیں اور ایک ہندو، جس کو کافر کہا جاتا ہے، اس کی حمایت کو کھڑا ہو۔ اس رسالے کی قوتِ استدلال اور اندازِ بیان سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ اس کے مصنف دراصل شبلی ہیں اور اس شبہ کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اعظم گڑھ میں لکھا گیا، جو مولانا کا وطن تھا اور وہ پوسٹ ماسٹر صاحب مولانا کے واقفِ کار اور شناسا بھی تھے۔[۷۲]

ایک اور اقتباس کا تقابل ملاحظہ کیجیے:

سر سید نے اپنی تفسیر کو عربی میں ترجمہ کرنا چاہا اور جب مولانا شبلی نے اپنی مصروفیتوں کی بنا پر عذر کیا تو مولانا حمید الدین فراہی پر نگاہ پڑی، جو اس وقت کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ترجمہ کا معاوضہ معقول تھا، یعنی ورق کے حساب سے پیش کیا جا رہا تھا، مگر مولانا حمید الدین نے انکار کر دیا اور جب سر سید نے بہ اصرار اس کی وجہ دریافت کی تو صاف کہہ دیا کہ وہ اشاعتِ باطل اور تعاون علی الاِثم کی معصیت میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے۔ مولانا حمید الدین کی اس صاف گوئی سے علامہ شبلی کا کوئی تعلق نہیں تھا، مگر سر سید کی بدگمانی میں اس سے بھی اضافہ ہوا۔[۷۳]

سر سید اپنی تفسیر کا عربی ترجمہ کرانا چاہتے تھے اور اس کے لیے ان کی نظر بار بار مولانا شبلی پر پڑتی تھی۔ مولانا سے جب اس کا ذکر آیا تو انھوں نے اپنی مصروفیتوں کا عذر کیا۔ اس کے بعد مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب فراہی پر نظر پڑی، جو اُس زمانہ میں عربی کی تکمیل کے بعد کالج میں پڑھتے تھے اور جنھوں نے سر سید کے حکم سے طبقاتِ ابنِ سعد کے ایک حصہ کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، مگر مولانا حمید الدین صاحب نے انکار کیا اور جب سر سید نے

---

[۷۱] ماخذ سابق، ص ۱۰۶۔

[۷۲] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۲۴۰۔

[۷۳] اقبال احمد خاں سہیل: سیرتِ شبلی مرتبہ فضل الرحمٰن اصلاحی، ص ۱۰۶-۱۰۷۔

بہ اصرار اس کی وجہ پوچھی تو صاف کہہ دیا کہ وہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون علی الإثم کے گناہ میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے۔ مولانا حمید الدین کی اس صاف گوئی میں گو مولانا شبلی کا کوئی تعلق نہ تھا، مگر سرسید کی بدگمانی میں اس سے اضافہ ہوا۔[۷۴]

***

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ علی گڑھ اور سرسید کے متعلق شبلی کے مبینہ خیالات اور باہمی کشمکش کی تشہیر نے ہی تنقیصِ شبلی کو فروغ دیا اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ 'بزم میں رزم کا رنگ' بھرنے کا کام سید سلیمان ندوی نے نہیں، اقبال احمد خاں سہیل نے کیا تھا۔ یہ درست سہی کہ اقبال احمد خاں سہیل اس تنازعے کے موجد تھے، لیکن اکتوبر ۱۹۳۶ء سے فروری ۱۹۳۹ء تک الاصلاح میں چھپنے والی 'سیرتِ شبلی' کی پندرہ قسطوں سے ہندوستان بھر میں کتنوں نے اثر لیا؟ لیکن جب یہی بیانات سید سلیمان ندوی کی مؤلفہ حیاتِ شبلی میں شامل ہوئے تو ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ یقیناً اقبال احمد خاں سہیل علمی و ادبی اعتبار سے اُس مقام پر فائز نہ تھے کہ ان کی کسی تحریر سے دنیائے ادب میں ارتعاش پیدا ہوتا، اس لیے علی گڑھ یا سرسید کے حلقے سے ان کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا، جب کہ سید سلیمان ندوی اپنی شخصیت اور اپنے علمی و ادبی مقام و مرتبہ کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں مذہب، سیاست، تہذیب اور علم و ادب کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہو رہے تھے، اس لیے حیاتِ شبلی کے مندرجات سے وہ مدّ و جزر پیدا ہوا کہ اس کی لہریں ایک صدی بعد بھی محسوس کی جا سکتی ہیں۔

---

[۷۴] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۲۴۰۔

رسالہ معارف کی شذرات نگاری

وصی الرحمٰن نعمانی
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، شبلی نیشنل پی. جی. کالج، اعظم گڑھ
wasiurrahmannomani@gmail.com

"معارف" اپنے علمی، تنقیدی اور اعلیٰ تاریخی اور مذہبی مضامین کی بنیاد پر صحافت کی اس تعریف میں نہیں آتا ہے جس میں دوسرے رسائل اور اخبارات شامل ہیں۔ وہ اخبار نہیں ہے بلکہ مجلہ ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ضرور ہے کہ اعلیٰ علمی و تحقیقی صحافت کا اگر کوئی خانہ ہے تو اس کے لحاظ سے معارف ان رسائل میں شامل ہو سکتا ہے جو صحافت کی تعریف میں آتے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد معارف کے "شذرات"[۱] پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ شذرات اصل میں معارف کا اداریہ ہی ہے جس کا عنوان شذرات کر دیا گیا اور پھر وہ اتنا مقبول ہوا کہ لوگوں نے شذرات کو اداریہ ہی کے معنی میں لے لیا۔ اب یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی کے اداریے کے بارے میں اگر کوئی بات کہنی ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب نے اپنے "شذرات" میں یہ بات کہی، حالانکہ شذرات، معارف کی اپنی اپج تھی۔ اس نے اپنے اداریے کو یہ عنوان اس لیے دیا کہ یہ "شذرات الذہب" یعنی یہ سونے کے ڈلے ہیں۔ چونکہ معارف کے ہر شمارے کے تین، چار صفحات میں مختلف مسائل پر الگ الگ پیراگرافوں میں گفتگو ہوتی تھی اس لیے الگ الگ اقتباسات کی وجہ سے ان کو شذرات کہا گیا۔ ڈاکٹر خورشید احمد نعمانی اپنی کتاب "دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات" میں شذرات کے سلسلے میں لکھا ہے:

> شذرات شذرہ کی جمع ہے، اس کے معنی سونے کے ڈلے ہوتے ہیں۔ سید صاحب نے معارف کے ادارتی صفحہ کا مستقل عنوان "شذرات" رکھا تھا، اس کے تحت ہر ماہ مدیر کے قلم سے مختلف النوع وقتی امور و مسائل کا ذکر یا ان پر تبصرہ ہوتا ہے۔[۲]

---

[۱] شذرات، شذرۃ (سونے کی ڈلی یا ٹکڑا) کی جمع ہے۔

[۲] خورشید نعمانی ردولوی، دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۴، حصہ دوم، ص ۲۷۶۔

جس طرح کسی اخبار میں اداریے کی اہمیت ہوتی ہے اسی طرح معارف کے شذرات بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو پڑھ کر پورے رسالے، ادارے اور اداریہ نویس کی فکر سامنے آجاتی ہے۔ کوئی ہنگامی یا وقتی واقعہ یا حادثہ یا ایسی خبر جو ملک و ملت کے یا دنیا میں کسی بھی مسئلے سے متعلق ہو اس پر اداریہ نگار کا تاثر "اداریہ" کہلاتا ہے۔ اس لحاظ سے معارف کے شذرات میں کسی غیر معمولی واقعے، کسی غیر معمولی خبر، کسی غیر معمولی حادثے پر یا علمی دنیا کی کسی اہم خبر یا کسی علمی کتاب کی اشاعت یا علمی بحث پر تبصرہ ہوتا ہے۔ یعنی اگر اہم حالات حاضرہ پر اظہار خیال کرنا اداریہ نگاری ہے تو معارف کے شذرات بھی اداریہ نگاری میں شامل ہیں۔ البتہ شذرات اپنے لکھنے والے، رسالے اور ادارے کی نسبت سے عام اداریہ نگاری سے کہیں زیادہ بلند اور وقیع ہے۔

اداریہ نویسی کے متعلق مشہور صحافی سہیل انجم نے احوال صحافت میں ایف فریر بانڈ کا قول نقل کیا ہے کہ "اداریہ ایک ایسا مضمون ہوتا ہے جو ہنگامیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس ہنگامی مضمون کا مقصد اخبار کی رائے کا اظہار ہے"۔[۳] انہوں نے ایک اور یوروپی دانشور ملر کے خیال کو بھی پیش کیا ہے کہ اداریہ اس مضمون کو کہتے ہیں جو کسی ہنگامی موضوع پر لکھا گیا ہو اور جس میں قاری کی سوچ کو ایسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو جو مضمون نگار کی رائے میں صحیح ہو۔ اداریہ نویس قاری کو اپنے نقطۂ نظر سے متفق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اداریہ دراصل کسی ہنگامی یا وقتی موضوع پر مدیر یا اداریہ نویس کی رائے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں اغیار کی رائے بیان نہیں کی جاتی بلکہ قاری سے اپنی بات کو منوانے کے لیے مدلل اور پختہ انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ مدیر اپنے اداریے کی مدد سے کسی مخصوص واقعے کو ایک خاص تناظر میں دیکھتا ہے اور اسی تناظر میں قارئین کو بھی شامل کرنا چاہتا ہے۔ مضمون طویل ہوتا ہے اور اداریہ مختصر ہوتا ہے۔ اختصار ہی اداریہ کی خوبی ہے۔ مضمون جہاں دو یا چار صفحات پر مشتمل ہوتا ہے وہیں اداریہ ایک کالم یا دو کالم کا ہوتا ہے اور اس میں وہ تمام نکتے شامل کر لیے جاتے ہیں جو اداریہ نویس قارئین کے سامنے رکھنا چاہتا ہے۔

اردو اخبارات میں عام طور پر ایک ہی موضوع پر اداریہ ہوتا ہے۔ شاید اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر مہنگائی پر لکھنا ہے تو اداریہ صرف مہنگائی پر ہو۔ دوسرے مسائل اس میں شامل نہ ہوں۔ چونکہ

---

[۳] سہیل انجم، احوالِ صحافت، ناشر: سہیل انجم، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲۷۔

زیادہ تر اخبار روزنامے ہوتے ہیں تو وہاں پوری گنجائش ہوتی ہے کہ ہر دن ایک نیا موضوع اختیار کیا جائے۔ معارف کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے ایک ہی موضوع یا ایک ہی واقعے پر بس نہیں کیا بلکہ وہ چھوٹے چھوٹے فقرات میں اختصار سے کئی موضوعات کا احاطہ کر لیتا ہے مثلاً اگر کوئی اچھی کتاب آئی یا الیکشن آیا یا مسلمانوں کا کوئی مسئلہ درپیش ہوا یا کسی کی وفات ہوگئی تو یہ ساری چیزیں ہم کو عام طور سے معارف کے شذرات میں مل جاتی ہیں۔ شاید اسی خصوصیت نے معارف کی اداریہ نویسی یعنی شذرات نگاری کو ایک الگ مقام دے دیا ہے۔

سہیل انجم نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض اداریے بہت طویل ہوتے ہیں، بعض قسط وار ہوتے ہیں۔ اس قول کی صحت کا اندازہ معارف سے بھی ہوتا ہے کہ بعض موضوعات پر طویل اداریے نظر آتے ہیں کیونکہ حالات اور معلومات کے لحاظ سے اس کی ضرورت تھی۔

ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ معارف کے شذرات میں ادبی و تنقیدی صحافت کی جھلک ہمیشہ ظاہر ہوتی ہے۔ رشید حسن خاں ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ صحافت اور ادب میں تضاد کی نسبت یہ ہے کہ اگر اخبار میں کوئی تحریر آتی ہے تو اس کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہوتی جو کسی مشہور ادیب یا نقاد کی تحریر کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ بحث دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ اب بھی نامکمل ہے کہ صحافت کی زبان اور صحافت کی تحریر کیا ادب کے دائرے میں آتی ہے؟ جیسا کہ رشید حسن خاں نے آغاز ہی اس بات سے کیا کہ ان دونوں میں تضاد ہے، لیکن وہ خود کہتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال میں جو تحریریں لکھیں وہ جب کتابی شکل میں سامنے آئیں تو بقول رشید حسن خاں یہ مضامین ادبیت کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہیں بلکہ اردو کی اعلیٰ ادبی تحریروں میں ان کو بلا تکلف پیش کیا جاسکتا ہے۔[۴]

مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ تحریریں اگر ادب کے اعلیٰ معیار پر ہیں تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا ان کا انداز نظر صحافیانہ نہیں تھا۔ جواب میں رشید حسن خاں کہتے ہیں کہ ہاں صحافیانہ نہیں تھا۔ ان کی شخصیت، ان کی طبیعت، ان کا جذبہ، ان کا احساس ادب ہے۔ اگر مولانا آزاد کی تحریروں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے تو پھر شذرات کے ادبی ہونے میں بھی کوئی پس و پیش نہیں کرنا چاہیے۔

---

[۴] ڈاکٹر ہمایوں اشرف (مرتب)، اردو صحافت مسائل اور امکانات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۵۵-۵۶۔

صحافیانہ ادب کوئی الگ چیز ہے یا یہ کہ وہ بھی ادب کے اعلیٰ معیار میں شامل ہے تو شذرات کو پڑھتے وقت اگر یہ چیزیں سامنے رہیں تو یہ تجزیہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ شذرات صحافیانہ ادب کے لحاظ سے ہو یا اصل ادب کے لحاظ سے ہو اپنی ایک الگ چھاپ چھوڑی ہے۔ ان کو اعلیٰ ادب میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی ان کو بغیر کسی تکلف کے ادارتی تحریروں کی صف میں بھی رکھا جاسکتا ہے۔

یہاں کچھ اور محققین کی آراء پیش ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شذرات زبان و اسلوب اور فکر و پیشکش اور موضوعات کے انتخاب کے لحاظ سے اعلیٰ ادب میں شامل ہیں۔[۵]

پروفیسر عبد المغنی نے لکھا ہے کہ "علم و ادب کی چاشنی نے جس اردو صحافت کو سب سے زیادہ قیمتی بنا دیا بلکہ اسے اس قابل بنا دیا کہ اس سے نہ صرف ادب بلکہ پورے معاشرے کی تاریخ کی ترتیب میں مدد لی جاسکتی ہے۔ اس میں انہوں نے جن رسائل کا ذکر کیا ہے اس میں الندوہ، الہلال اور صدق وغیرہ شامل ہیں۔ اس ذکر میں معارف کے متعلق انہوں نے لکھا کہ معارف ایک علمی ادارے کا ترجمان ہے اور یہ ان رسالوں میں سے ہے جو ادبی ہی نہیں بلکہ معاشرے کی ترجمانی کا فخر رکھتا ہے۔ اس لیے کوئی شک نہیں کہ اگر ادبی صحافت کی کوئی تاریخ مرتب کی جائے تو معارف کے شذرات کو اس میں شان کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے"۔[۶]

پروفیسر عبد المغنی نے مزید لکھا ہے کہ آزادی کے بعد ادبی صحافت میں جو رسائل نمایاں ہیں ان میں معارف بھی ہے۔[۷] اس وقت معارف سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی ادارت میں نکل رہا تھا۔

ڈاکٹر نعیم صدیقی نے مولانا سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی جس میں ان کے مقالے میں شذرات کا الگ طریقے سے ذکر کیا ہے :

> سید صاحب کے شذرات بھی نہایت اہم ہوتے تھے۔ عموماً مختلف النوع، وقتی رموز و مسائل اور کبھی کبھی مستقل معاملات پر شذرات میں اظہار خیال کرتے تھے۔ اس لیے ان کے شذرات مباحث و مسائل کے تنوع کی حیثیت سے دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان سے گزشتہ تیس پینتس سال کی قومی و ملی تحریکوں، مختلف خیالات و رجحانات اور دوسرے پیش آمدہ حالات

---

[۵] ماخذ سابق

[۶] ماخذ سابق، ص ۶۶

[۷] ماخذ سابق، ۷۰۔

کی تاریخ مقرر کی جاسکتی ہے، اور ان کے متعلق مصنف کے خیالات معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے شذرات غور و فکر، خیالات کی صحت و پختگی اور اصابت رائے کا نمونہ اور ایجاز و اختصار اور بلاغت کے لحاظ سے ادب و انشاء کے شاہکار ہیں۔ [۸]

مولانا عبد الماجد دریابادی نے جس طریقے سے شذرات سلیمانی کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے وہ بار بار پڑھنے کے لائق ہے:

صاحب معارف کی شذرات نگاری ایک خصوصی و امتیازی شان نگارش رکھتی ہے۔ بے لاگ لیکن نہ درشت نہ کرخت۔ عمیق لیکن نہ ادق نہ مغلق۔ رنگین لیکن نہ پر تکلف نہ ثقیل۔ سلیس لیکن نہ سطحی نہ عامیانہ۔ شگفتہ لیکن نہ ناولانہ نہ خطیبانہ۔ جاندار لیکن نہ گرما گرم نہ پر خروش۔ صالح لیکن نہ خشک نہ مولویانہ۔ سلیمانی ادب و انشاء کا اردو کی تاریخ ادب و انشاء میں جو ایک خاص مقام ہے اس کی اصل بنیاد ہی معارف کے ادارتی صفحات سے پڑی اور معارف کے شذرات نے بہتوں کے لیے ایک نئی راہ کھول دی۔ [۹]

مولانا ضیاء الدین اصلاحی معارف کے اہم مدیروں میں شامل ہیں۔ ان کی شذرات نگاری کے بارے میں ڈاکٹر فخر الاسلام اصلاحی نے لکھا ہے کہ مولانا کے لیے معارف کی ادارت بہت بڑا چیلنج تھی کیوں کہ سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی اور صباح الدین عبد الرحمٰن جیسے معیاری، پر مغز اور بصیرت افروز شذرات لکھنا یقیناً ایک مشکل کام تھا۔ مولانا نے معارف اور اس کے شذرات دونوں کے معیار کو قائم رکھا اور یہی وجہ تھی کہ جو ہمعصر ادیب اور انشا پرداز تھے انہوں نے شذرات کی جامعیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ [۱۰]

شذرات کے سلسلے میں یہ بات بھی بہت اہم کہی گئی ہے کہ شذرات کی کامیابی کا راز جس چیز میں ہے وہ ایک تو سلجھا ہوا انداز فکر، تجزیاتی ذہن، حالات حاضرہ سے آگہی و واقفیت، اور خلوص و ملی دردمندی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ادب و انشاء کا بلند ترین معیار بھی تحریر کا جز ہو۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو معارف کی شذرات نگاری میں مسلسل پائی گئیں، اسی لیے اہل نظر نے اس کا

---

[۸] محمد نعیم صدیقی، علامہ سید سلیمان ندوی: شخصیت و ادبی خدمات، مکتبۂ ندویہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۲۰۱۶ء، ص ۳۲۷۔

[۹] ماخذ سابق، ص ۳۲۷۔

[۱۰] محمد طارق (مرتب)، مولانا ضیاء الدین اصلاحی حیات و خدمات، شبلی چلڈرن اسکول، نظام آباد، اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء، ص ۳۰۶۔۳۰۷

اعتراف کیا۔[11]

شذرات کے متعلق گفتگو میں پاکستان کے مشہور محقق ڈاکٹر معین الدین عقیل کی یہ بات قابل ذکر ہے کہ شذرات نگاری علمی و ادبی صحافت کا لازمی جزر ہی ہے۔ انہوں نے اداریہ نویسی اور شذرہ نویسی میں فرق کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اخبارات میں جو کچھ لکھا جاتا ہے چاہے مختصر ہو یا طویل، وہ تحریر اداریہ کہلائے گی لیکن رسائل کی ادارتی تحریریں جو سنجیدگی اور گہرائی سے لکھی جاتی ہیں وہ مدیر کے ایسے خیالات ہیں جن میں وقتی موضوعات کے علاوہ علمی، فکری مباحث، تہذیب و ثقافت کے مضامین اور مدیر کے شخصی اور ذاتی تاثرات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ صفت اردو میں سب سے پہلے معارف کے شذرات کی وجہ سے آئی۔ چنانچہ اکثر محققین نے شذرہ نویسی کو ایک الگ موضوع بنا دیا۔ انہوں نے لکھا کہ معارف کا اپنے معیار اور مرتبے کے لحاظ سے اسے جو وقار اور تمکنت کا مقام ہے وہ اس کے شذرات کی وجہ سے ہے۔ شذرات کی روایت تو سید سلیمان ندوی کے زمانے میں ہی نمایاں ہو چکی تھی لیکن موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے اس روایت کو مزید وقار صباح الدین عبد الرحمٰن کے زمانۂ ادارت میں حاصل ہوا۔[12]

ان شذرات کی اگر موضوعاتی تقسیم کی جائے تو یہ علوم سلیمانیہ کے ہر شعبہ میں جگہ پا جائیں گے۔ اس کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ادب سلیمانی میں شذرات ایک خاص امتیاز اور اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی پذیرائی بھی شاید اسی لیے زیادہ ہوئی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ”آپ کے شذرات اور معارف کا وجود ندوۃ العلماء کی کامیابی پر برہان قاطع ہے، علوم دینیہ تو موجود تھے لیکن صورتحال یہ تھی کہ:

طاؤس را ز نقش و نگارے کہ ہست خلق تحسین کنند او خجل از پائے زشت خویش“[13]

خود سید سلیمان ان شذرات کو جو اہمیت دیتے تھے وہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی نے دو سال شذرات لکھنے کی ذمہ داری قبول کی۔ ایک خط میں ان کو سید صاحب

---

(11) ماخذ سابق۔

(12) صباح الدین عبد الرحمٰن، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، مرتب: ڈاکٹر مہ جبین زیدی، منزل اکیڈمی، ناظم آباد، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ا۔

(13) مجیب اللہ ندوی، افکار سلیمانی، ندوۃ التالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ، ۱۹۹۶ء، ص ۲۵۲۔

نے لکھا: ”شذرات اور اخبار علمیہ کی طرز تحریر میں ذرا فرق ہونا چاہیے۔ اخبار علمیہ چھوٹے، سادے اور بلا اظہار رائے ہوں۔ شذرات مع اظہار رائے رنگین اور چٹ پٹے ہوں“۔ مولانا دریابادی نے ایک بار شذرات میں مسلمانوں کو غیرت دلانے کے لیے برادران وطن کے علمی تعلیمی اور تمدنی کارنامے بیان کیے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کو یہ طرز پسند نہ آیا۔ انہوں نے سید صاحب سے ایک خط میں اس کا اظہار کیا۔ چنانچہ سید صاحب نے مولانا دریابادی کو لکھا کہ مولانا شروانی کا خط آیا ہے کہ معارف کے شذرات میں برادران وطن کے موجودہ کارنامے جس طرح لکھے جاتے ہیں اس سے مرعوبیت کی بو آتی ہے جس سے خوف ہے کہ قوائے قومی اور زیادہ مضمحل نہ ہو جائیں، اس لیے طریقۂ تحریر بدلنا چاہیے۔ ۱۹۲۰ء میں جب سید صاحب لندن میں تھے تو شذرات میں مولانا دریابادی نے فلسفۂ پیام امن کے غلبے کے نتیجے میں بعض خیالات کا اظہار کیا تو سید صاحب نے لندن ہی سے خط لکھا جو شذرات کے متعلق ان کی فکر و توجہ کو ظاہر کرتا ہے:

> فروری کا معارف پہنچا قطعاً آپ کی اس رائے کا مؤید نہیں کہ خسرو کی تلاش کرو تغلق کی نہیں، سعد زنگی کی حاجت نہیں، حافظ مطلوب ہے، شاہ شجاع نہیں، ابن رشد کو ڈھونڈو، حکم کو نہیں، شیخ الاشراق بس ہیں، سلطان درکار نہیں، ابن سینا سے مطلب ہے خوارزم شاہ اور ابوالمعالی قابوس سے نہیں۔ میرے امن طلب دوست اور سکون پسند فلسفی، تخیل اور عمل دو مختلف عالم ہیں۔ تغلق نے خسرو کو پیدا کیا، اکبر نے عرفی کو نشوونما بخشا۔ قابوس و خوارزم شاہ نے ابن سینا کو ابن سینا بنایا۔ دولت سامانی نہ ہوتی تو ابن سینا کو گنجینۂ علوم کتب خانہ میسر نہ آسکتا۔ سلجوق و ترک نہ ہوتے تو جلال الدین رومی ایشیائے کوچک کی سرزمین میں نہ پیدا ہوتے۔ محکوم قوم کا درماندہ دماغ فلسفۂ عمل کے نکتہ کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ قابوس اگر حاکم قوم میں پیدا ہوتا تو اس کو اپنے تجربہ خانہ کے لیے دربدر بھیک نہ مانگنی پڑتی۔ ٹیگور کا عالم تخیل اگر اس کی دنیائے عمل کے مطابق ہوتا تو خطاب اعزازی سے محرومی پسند کرتا۔ انسان کے تمام دماغی و جسمانی قوی اس قوائے مہیجہ کے ماتحت ہیں، دل افسردہ قوم کے لیے فلسفہ کا امن اور نہ شاعری کا ہنگامہ، کوئی چیز مطلوب نہیں، خیام کا پرسکون دماغ ملک شاہ سلجوقی کی تلوار کے سایہ میں آرام پارہا تھا۔[۱۴]

اسی لیے مولانا مسعود علی ندوی کے نام ایک خط میں سید صاحب نے لکھا کہ امن پسندی اور صلح جوئی کی یہ پالیسی معارف کے لیے ان کو پسند نہیں۔ یہاں یہ بھی قابل توجہ ہے کہ مولانا

---

[۱۴] ماخذ سابق، ص ۲۵۳۔۲۵۴۔

دریابادی شاید اس مسئلے میں سید صاحب سے متفق نہ ہوسکے تو سید صاحب نے ملاطفت کے لہجہ میں ان کو لکھا کہ مولوی مسعود علی صاحب سے معلوم ہوا کہ شذرات کے مسئلے کی نسبت آپ کو اختلاف ہے۔ عرض یہ ہے کہ کیا اس مسئلے میں کوئی کمپرومائز کی صورت نہیں نکل سکتی؟[۱۵]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شذرات کو سید صاحب محض وقتی اور عارضی مسائل پر اظہار خیال کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ مباحث و مسائل کے تنوع، غور و فکر، خیالات کی صحت و پختگی، اصابت رائے، ایجاز و اختصار اور بلاغت کے عناصر ترکیبی سے اس کو اس مقام تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے جہاں وہ مسلمانان ہند کی فکری نمائندگی اور ان کی ذہن سازی کرنے لگے۔

معارف کے شذرات ابتدا ہی سے خاصے کی چیز رہے ہیں۔ شاہ معین الدین ندوی نے ان کی خصوصیات کا نہایت عمدہ تجزیہ کیا ہے:

> سید صاحب کے شذرات بھی نہایت اہم ہوتے تھے، عموماً مختلف النوع، وقتی امور و مسائل اور کبھی کبھی مستقل معاملات پر شذرات میں اظہار خیال فرماتے تھے۔ اس لیے ان کے شذرات مباحث و مسائل کے تنوع کی حیثیت سے دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان سے گزشتہ تیس پینتس سال کی قومی و ملی تحریکوں، مختلف خیالات و رجحانات اور دوسرے پیش آمدہ حالات کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے، اور ان کے متعلق مصنف کے خیالات معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے شذرات غور و فکر، خیالات کی صحت و پختگی اور اصابت رائے کا نمونہ اور ایجاز و اختصار اور بلاغت کے لحاظ سے ادب و انشاء کا شاہکار ہیں۔[۱۶]

سید صاحب ایک بیدار ذہن کے ساتھ دردمند دل بھی رکھتے تھے۔ اس لیے دنیا کے کسی حصے میں اگر مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی تو وہ بے چین و مضطرب ہو جایا کرتے تھے۔ شذرات میں وہ کہیں مسلمانوں کی غفلت اور بے توجہی پر گریہ کناں ہیں، کبھی نوجوانوں کی کج روی پر آنسو بہاتے ہیں، کبھی عظمت رفتہ کو یاد کرتے ہیں اور کبھی ان کی ذہنی پسماندگی پر جھنجوڑتے ہیں اور ایک ضرب کلیمی لگا کر ان میں خودشناسی اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، کبھی لسانی تعصب و تنگ نظری پر حکومت وقت کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور کبھی کسی عزیز دوست، ہمدرد دیرینہ یا بزرگ قوم کی موت پر خون کے آنسو بہاتے ہیں اور دوسروں کو بھی رلاتے ہیں۔

---

[۱۵] ماخذ سابق، ص ۲۵۴

[۱۶] خورشید نعمانی ردولوی، دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات، ص ۲۷۶۔

خورشید نعمانی ردولوی نے شذرات کی ایک اور خوبی کی جانب توجہ دلائی ہے، جس کو یہاں پیش کیا جانا ضروری ہے کہ اس سے شذرات پر گفتگو مکمل کہی جاسکتی ہے:

> سید صاحب ہر قسم کے اہم مسائل پر شذرات میں اظہار خیال کرتے تھے، لیکن خصوصیت کے ساتھ وہ شذرات جو مسلمانوں کی مذہبی وملی زندگی کے اجزاو عناصر پر لکھے گئے ہیں، ان میں ان کی ترقی و تنزل اور بقاو استحکام کا پورا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔ یہ شذرات وقتی اور عارضی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ ان کی مستقل حیثیت درس کی سی ہے جن سے ہر زمانہ میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ان شذرات کے الگ الگ مجموعے شایع کیے جائیں اور ادب وانشاء کے طالب علم اور صحافت وسیاست کے نووارد اُن سے حسن بیان، متانت تحریر اور اصابت رائے کا سبق لیں۔[۱۷]

یہاں یہ بتانا مناسب ہے کہ جن مجموعوں کی اشاعت کی بات کہی گئی وہ بعد میں دارالمصنفین سے شائع ہونے والی "شذرات سلیمانی" کے ذریعے ممکن ہوئی۔ شذرات سلیمانی کی تین جلدیں ہیں۔ جن میں سید صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے تمام شذرات جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہ شذرات سلیمانی بالترتیب۔ ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۹ء، میں اشاعت پذیر ہوئے۔

---

[۱۷] خورشید نعمانی ردولوی۔ دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات ص، ۲۷۷۔

تبصرۂ کتب

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان (مترجم و شارح)، دی گلوریَس قرآن *The Glorious Quran*، فاروس میڈیا، دہلی، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۲۴، ۱۲۱۶ صفحات مجلد (عربی متن کے ساتھ) ہدیہ: ۱۱۹۵ روپے۔ صرف انگریزی ایڈیشن ۸۱۶ صفحات مجلد، ہدیہ: ۷۹۵ روپے۔ ایمیل: books@pharosmedia.com

قرآن پاک ایک ایسی منفرد کتاب الٰہی ہے جو انسانوں کے لئے سراپا ہدایت و رحمت اور رہنمائے حیات ہے۔ یہ انسانی سماج کے انفرادی و اجتماعی تمام مشاکل و مسائل کا جامع و پائیدار حل پیش کرتی ہے۔ یہی وہ مقدس کتاب ہے جو تا قیامت امنِ عالم اور سماجی انصاف کا منبع و سرچشمہ بھی ہے۔ یہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرنے والی کتاب ہے جس کی وجہ سے قرآنِ کریم ہر دور میں اہل علم کے بحث و تحقیق اور مطالعے کا ایک مستقل موضوع رہا ہے اور علمی و ادبی اور دینی حیثیت سے اہل علم کے لئے باعث دلچسپی بھی۔ اسی طرح قرآنِ پاک کی جامع تعلیمات، اس کے اعلیٰ اغراض و مقاصد اور اس کے فصیح و بلیغ الفاظ و نصوص کو سمجھنے اور روحِ قرآن تک پہنچنے کے لیے ہر دور میں ترجمہ، تشریح اور تفسیر کا کام ہوتا رہا ہے۔ بہ طورِ خاص غیر عربی داں افراد کے لیے دنیا بھر میں بولی اور سمجھی جانے والی تقریباً ہر زبان میں قرآنِ مجید کے تراجم ہوئے اور اس کی تشریح و تفسیر بیان کی گئی۔ ان میں انگریزی تراجم و تفاسیر خصوصی اہمیت وافادیت کی حامل ہیں۔

جہاں تک ہندستان اور برّ صغیر میں قرآنِ کریم کے انگریزی تراجم کا تعلق ہے تو عبد اللہ یوسف علی کا ترجمۂ قرآن انگریزی داں طبقے کے درمیان مقبولیت کے اعتبار سے اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی پیش نظر ترجمۂ کلام پاک بھی ہے جس کا پہلا ایڈیشن دہلی کے معروف ناشر فاروس میڈیا نے ۲۰۲۳ میں ۱۲۳۳ صفحات میں شائع کیا ہے اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر آچکا ہے۔

قرآنِ پاک کے اس منفرد اور معیاری انگریزی ترجمے کے مترجم ہندوستان کے مایۂ ناز اسلامی اسکالر ڈاکٹر ظفر الاسلام خان ہیں۔ موصوف کا شمار ہندوستان اور عالم اسلام کی معروف شخصیات میں ہوتا ہے۔ آپ جامعۃ الازہر اور قاہرہ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں، نیز آپ نے مانچسٹر یونیورسٹی (برطانیہ) سے اسلامیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ موصوف کو عربی اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ وہ عربی، انگریزی اور اردو زبانوں میں تقریباً ۵۰ رکتابوں کے مترجم و مصنف بھی ہیں۔ آپ لندن میں واقع مسلم انسٹی ٹیوٹ میں طویل عرصے

تک ریسرچ فیلو بھی رہ چکے ہیں۔ موصوف جہاں ایک طرف عربی زبان اور تہذیب و تمدن کے ماہر ہیں تو دوسری جانب جدید علوم و فنون پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ نیز آپ جدید طبقے کی نفسیات وذہنی ساخت اور ان کے جدید معیار سے بہ خوبی واقف ہیں۔

زیر مطالعہ قرآنِ کریم کے انگریزی ترجمے کی ابتدا کا پس منظر اور محرک یہ ہے کہ جب ڈاکٹر ظفر الاسلام خان ۱۹۸۰ میں مسلم انسٹی ٹیوٹ، لندن میں بہ حیثیت ریسرچ فیلو بحث و تحقیق میں مشغول تھے اُن ہی دنوں عبد اللہ یوسف علی کا ترجمۂ قرآن ان کے زیرِ استفادہ تھا۔ ہر چند کہ عبد اللہ یوسف علی کے ترجمۂ قرآن کو ہندوستان کے انگریزی ترجموں اور تفاسیر میں امتیاز حاصل ہے اور وہ انگریزی داں طبقے کے درمیاں خاصا مقبول بھی رہا ہے، مگر ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے اس ترجمے میں بہت ساری خامیاں پائیں۔ مثلاً متروک الفاظ کا بہ کثرت استعمال، بائبل کی اصطلاحات، مسجع زبان کا استعمال اور ایک ہی لفظ کا مختلف مقامات پر مختلف ترجمہ۔ نیز عبد اللہ یوسف علی نے کہیں کہیں عربی لفظ یا اصطلاح کو سمجھنے میں غلطی کی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اُن ہی دنوں ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے عبد اللہ یوسف علی کے ترجمۂ قرآن پاک کے تصحیح اور اس پر نظر ثانی کا عزم کیا اور بالآخر ۲۱ جنوری ۲۰۱۱ کو انھوں نے اس کام کا آغاز کر دیا۔ اگرچہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے عبد اللہ یوسف علی کے ترجمے کی تصحیح اور اس پر نظر ثانی کی غرض سے یہ کام شروع کیا تھا مگر رفتہ رفتہ یہ کام پھیلتا چلا گیا اور ترجمے کی صحت، حواشی و شروح کی جدت، کثرت اور تنوع کی وجہ سے یہ ایک مستقل اور منفرد و جامع ترجمے کی شکل اختیار کر گیا اور عبد اللہ یوسف علی کے ترجمے کا اس پر کوئی خاص اثر نہ رہا جسے قاری خود محسوس کر سکتا ہے۔

اس ترجمے و تشریح کی صحت میں ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے حد درجہ احتیاط اور امانت داری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ طباعت سے قبل مترجم موصوف نے اسے شروع سے آخر تک تقریباً سات مرتبہ خود دیکھا نیز دنیا بھر کے ماہرینِ قرآنیات، اسلامی اسکالرز اور قرآن مجید کے موضوع سے شغف رکھنے والی ۷۰؍ ممتاز شخصیات کے پاس اس پر نظرثانی، تصحیح، حذف و اضافہ، قیمتی آرا اور مشوروں کے لیے ارسال کیا جو بہ ذات خود اس کی صحت و جامعیت کی بڑی دلیل ہے۔

پیش نظر ترجمے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مترجم نے اس کی تکمیل کے دوران عبد اللہ یوسف علی کے ترجمے کے علاوہ کسی بھی زبان میں دیگر ترجموں سے استفادہ نہیں کیا بلکہ براہِ راست انھوں نے عربی زبان میں موجود تفاسیر و حدیث کے اصلی مآخذ اور بنیادی مصادر و مراجع سے ہی بھرپور مدد لی نیز آیاتِ قرآنی اور الفاظ کے معانی، سیاق و سباق کی وضاحت کے لیے عربی زبان کی

مستند و معتبر ڈکشنریز سے استفادہ کیا۔

علاوہ ازیں خاص بات یہ ہے کہ ترجمہ و تشریح کے دوران کسی خاص مسلکی نظریے یا فلسفیانہ فکر کو پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ قرآنِ کریم کے اصل معانی و مطالب کو آسان زبان اور نہایت خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے جو قرآنی الفاظ اور نصوص قرآن کے سیاق سے واضح ہوتے ہیں نیز دورِ اول میں اُسے جیسا سمجھا گیا ویسا ہی بیان کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔

نصوصِ قرآن کو بہتر طور پر سمجھ کر اس کے ترجمے و تشریح کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے اس اہم عمل میں مترجم موصوف نے صرف عربی زبان میں موجود مستند قدیم تفاسیر ہی سے استفادہ کیا ہے، مثلاً تفسیر طبری، ابن کثیر، زمخشری، القرطبی، الجصاص کی 'احکام القرآن' وغیرہ۔ اسی طرح مشکل الفاظ و اصطلاحات کو سمجھنے کے لیے اصفہانی کی مفردات، ابن منظور کی لسان العرب اور ای۔ ڈبلیو۔ لین کی *Lexicon* سے مدد لی گئی ہے، جب کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے متعلق واقعات و حوادث کی تفہیم و بیان کے لیے سیرتِ ابن ہشام، الواقدی کی المغازی اور طبقاتِ ابن سعد وغیرہ جیسی مستند و قابل اعتبار مراجع کو سامنے رکھا ہے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے اس انگریزی ترجمے کی خوبی یہ بھی ہے کہ جہاں عربی کے کسی لفظ یا کسی آیت کے دو معانی نکل رہے تھے وہاں مترجم نے اس معنی کو ترجیح دی ہے جو سیاق کے اعتبار سے قریب الفہم ہو اور روحِ قرآن کو سمجھنے میں آسانی پیدا کرے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے دوسرے معنی کو بھی حاشیے میں بیان کر دیا ہے۔

مذکورہ ترجمے میں کسی بھی لسانی یا نحوی و صرفی مسئلے کی بحث سے گریز کیا گیا ہے۔ قرآنی نصوص کے عربی الفاظ کے مقابل انگریزی الفاظ جو معنی کی ادائیگی کے لیے زیادہ مناسب اور موزوں تھے اُن ہی کو استعمال کیا گیا ہے۔ جہاں ایسا ممکن نہیں تھا وہاں عربی اصطلاحات کی وضاحت حواشی میں کر دی گئی ہے۔

رشد و ہدایت اور امن و شانتی کے دشمنوں کی جانب سے وقتاً فوقتاً قرآن پاک کے خلاف شکوک و شبہات اور طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں اور پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ نعوذ باللہ قرآن جنگ اور تشدد کو بڑھاوا دینے والی کتاب ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک سراپا رشد و ہدایت اور پیام امن و شانتی سے بھرپور کتاب اور دستور حیات ہے۔ اس کلام الٰہی کی جامع تعلیمات دنیا کے سامنے اسی وقت آشکارا ہو گی جب قرآن پاک کو اس کے بنیادی مآخذ کے ذریعے اور اس کے سیاق و سباق میں سمجھا جائے۔ زیر بحث بنیادی مآخذ پر مبنی ترجمۂ قرآن میں ترجمے کے ساتھ ساتھ

نئے حواشی شامل کرنے کا فاضل مترجم کا مقصد قرآن کریم کے اصل معانی و مفاہیم کو عام قارئین تک پہنچانا ہے اور اس کے سیاق سے آگاہ کرنا ہے تاکہ روحِ قرآن کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہ ہو، ساتھ ہی ساتھ ترجمے کے قارئین کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات بھی وہیں مل جائیں۔

قرآن کریم کو اس کے بنیادی مآخذ اور اصلی مصادر و مراجع کے ذریعہ ہی سمجھنے اور اس کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں اتارنے پر مترجم موصوف نے زور دیا ہے اور اس کی طرف سورۃ الفرقان، آیت نمبر ۳۰: "وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا" (اور رسول کہیں گے کہ اے میرے پروردگار! میری [اس] قوم نے اس قرآن کو بالکل نظر انداز کر رکھا تھا) کے انگریزی ترجمہ کے بعد حاشیہ میں لکھتے ہیں:

> آج مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن پاک کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ اسلام کے بارے میں ثانوی مآخذ مثلاً فقہ کی کتابوں سے معلومات حاصل کرتے ہیں نہ کہ براہِ راست خدا کے نازل کردہ کلام سے جو بڑی احتیاط سے محفوظ ہے۔ اگر کوئی مسلمان قرآن کی تلاوت کر رہا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ براہِ راست بنیادی ماخذ سے اسلامی تعلیمات حاصل کرے، بلکہ اس کام سے اس کا مقصد صرف ثواب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی زندگی میں انقلابی تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنے ایمان و عقیدے کو خدا کے نازل کردہ اس اصلی ماخذ سے حاصل کریں جو قیامت تک کے لئے دنیا میں ہر فرد کے لئے اللہ کا ذاتی پیغام ہے۔ جو لوگ عربی زبان نہیں جانتے وہ موجودہ دور میں دنیا کی تمام زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمے پڑھ سکتے ہیں۔ (دی گلوریس قرآن، طبع دوم، ص: ۵۴۱۔۵۴۲)

مترجم موصوف نے قرآن پاک کے اس ترجمے کو دنیا کے سامنے پیش کر کے یہ پیغام بھی دینے کی کوشش کی ہے کہ قرآن پاک کے ترجمہ وتفسیر کو تمام مسلکی اختلافات اور فلسفیانہ موشگافیوں سے دور رکھا جائے اور اسے ویسا ہی سمجھا جائے جیسا کہ وہ نازل ہوا تھا۔ اور اس کی تشریح و تفسیر میں احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دور اول کے علماء کی تحریروں سے استفادہ کیا جائے تاکہ قرآنی پیغام کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور بنی نوع انسان اپنی زندگی میں اسے بآسانی برت سکے۔

موجودہ دور میں قرآنِ پاک کے انگریزی تراجم کی کمی نہیں، مگر پیشِ نظر ترجمہ، ترجمانی و تفہیم کی صحت، زبان کی پختگی، سلاست، اسلوب کی سادگی اور اپنی تاثیر کے اعتبار سے سابقہ تمام انگریزی تراجم و تفاسیر سے منفرد ہے جو کہ عالم انسانیت کو قرآن پاک کے آفاقی پیام سے روشناس

کرانے میں یقیناً مددگار و معاون ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کا یہ بے مثال کارنامہ عربی متن کے ساتھ ساتھ معیاری و سلیس انگریزی ترجمہ، جامع مقدمہ، قرآن مجید کا تعارف، اسماء حسنیٰ کا تفصیلی ذکر، نبی پاکؐ کی حیاتِ طیبہ کی تفصیل، بیش قیمت حواشی، اہم ضمیمے اور اشاریے پر مشتمل ہے جو اگر ایک طرف روحِ قرآن اور اس کی تعلیمات کو انگریزی داں طبقے تک بہتر طریقے سے پہنچانے کی خاطر مترجم کی زبان دانی اور ان کے جدید و مؤثر اسلوب پر دلالت کرتی ہیں تو دوسری طرف موصوف کے مطالعۂ قرآن کی وسعت، قرآن و علوم قرآن سے جنون کی حد تک شغف اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بیان کرتی ہیں۔

قرآن پاک سے شغف اور اس موضوع پر قلم اٹھانا توفیق الٰہی اور بڑی سعادت مندی کی بات ہے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ ہر مؤمن اہل علم و قلم کی دیرینہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے سیرت نبوی ﷺ یا قرآن پاک کے موضوع پر بطور سرمایۂ زندگی کچھ نہ کچھ دنیا کے سامنے پیش کرنے کا شرف حاصل ہو۔

قرآنِ کریم کا یہ انگریزی ترجمہ مترجم موصوف کے اخلاص و بلند ہمتی کا شاہکار ہے اور ان کی زندگی کا ماحصل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ قابلِ قدر مترجم کے اس مقدس عمل کو ان کے لیے ذخیرۂ آخرت اور قارئین کے لیے باعثِ ہدایت بنائے۔ آمین!

(پروفیسر محمد قطب الدین، شعبۂ عربی، جے این یو، نئی دلی)

basmaqutb@gmail.com

نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی، تفسیر ماجدی ایک جائزہ، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۱۴۴، ملنے کا پتہ: پروفیسر خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، سن اشاعت، ۲۰۲۳ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، ای میل : bbpublication@gmail.com

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی نظر علوم قدیمہ کے ساتھ علوم جدیدہ پر بڑی گہری تھی۔ انہوں نے جدید فلسفیانہ نظریات کا مطالعہ بڑی دقت نظری اور باریک بینی سے کیا تھا۔ تفسیر ماجدی اردو میں ان کی بہت مشہور اور بعض لحاظ سے منفرد تفسیر ہے۔ انہوں نے قدیم روش سے قدرے ہٹ کر اس میں اقدامی، علمی، تحقیقی، تقابلی، ایجابی اور معروضی اسلوب اپنایا تھا۔ تفسیر میں جگہ جگہ ان کے اس اسلوب کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے یہی اوصاف اردو کی دوسری تفسیروں سے اس کو الگ کرتے ہیں۔ امام رازی کی تفسیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں عقلی اور فلسفیانہ علوم

اور متکلمانہ دلائل کی روشنی میں زیادہ بحثیں ملیں گی۔ اردو تفسیروں میں تفسیر ماجدی کو اس کے سائنسی اور عقلی مباحث کی وجہ سے مقام انفرادیت حاصل ہے۔ مصنّف کے بہ قول یہ پہلے انگریزی میں چار اور بعد میں اردو میں سات جلدوں میں شائع ہوئی۔

زیر نظر مختصر کتاب میں کل تین ابواب ہیں۔ پہلا مفسر کے سوانح سے متعلق ہے۔ دوسرے میں تفسیر کی ابتدا، اس کی اشاعتی تفصیلات، مصادر و مآخذ کا تذکرہ اور چند قرآنی آیات کا دوسرے مفسرین مثلاً صاحب معارف القرآن و صاحب تفہیم القرآن وغیرہ سے تقابل کیا گیا ہے۔ تیسرے میں اس تفسیر کے باب میں ممتاز علما کے آرا اور زیر نظر کتاب کے مآخذ نقل کیے گئے ہیں۔ اپنے زمانے کی سات جلدوں پر مشتمل اس اہم تفسیر کے جائزہ کے لیے قرآنیات سے خاصے شغف و مطالعہ، یکسوئی، انہماک اور توجہ کی ضرورت ہوگی تاکہ اس سمندر کے اندر موجود گوہر پاروں کو سلیقے سے پیش کیا جاسکے۔ لیکن مذکورہ ابواب اور تفصیلات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جائزے میں موضوع کو مطلوب توجہ نہیں دی گئی ہے۔ حالانکہ مصنّف اس سے پہلے مولانا عبد الماجد کی بعض اہم چیزوں کو سلیقے سے پیش کر چکے ہیں۔

اہل علم کو معلوم ہے کہ اس تفسیر نے اس دور کے ممتاز علما کو اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ جامعیت و تحقیق کے اعتبار سے خاص طور پر اپنی جانب متوجہ کیا تھا اور مدیر معارف مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس پر معارف میں تبصرے کے دوران لکھا تھا کہ تفسیر ماجدی نہایت جامع اور محققانہ تفسیر ہے اور اس میں دین داروں اور عقل پرستوں دونوں کی تشفی کا سامان موجود ہے۔ اچھا موقع تھا کہ آج کے عقل پرستوں کے سامنے تفسیر ماجدی کے اس پہلو کو نمایاں کر دیا جاتا۔ بعض علما کے آرا نقل کر دینے سے جائزہ کی ایک شکل تو ایک جگہ ضرور سامنے آگئی ہے لیکن سرد کے اس رویے سے تفسیر ماجدی کے متعلق صاحب کتاب کا اپنا بھرپور مطالعہ پس پردہ چلا گیا ہے۔ بہر حال یہی کیا کم ہے کہ ایک عرصے بعد تفسیر ماجدی کے متعلق بعض بڑی قیمتی معلومات ایک جگہ سامنے آگئی ہیں۔ خلیق احمد نظامی سنٹر اس کتاب کی اشاعت کے لیے تحسین و آفریں کا مستحق ہے۔ (کلیم صفات اصلاحی)

محمد عارف اصلاحی، ایمانی کہانیاں، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد، صفحات ۱۲۸، ملنے کا پتہ: البدر بک سینٹر، مہاجنی ٹولہ، سرائے میر، اعظم گڑھ، سن اشاعت، ۲۰۲۳، قیمت: ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۸۰۰۴۱۰۲۴۲۶ و ۹۸۳۹۵۹۱۴۳۴۔ ای میل: درج نہیں۔

بچوں کے ادب پر لکھنا بڑا مشکل اور دقت طلب کام ہے۔ اس شہادت گہ الفت میں قدم

رکھنے کی ہمت وہی کرے گا جس کا جوش جنوں بچوں کی پل پل بدلتی نفسیات کو تاڑ لینے کی صلاحیت کا حامل ہو گا۔ مصنّف کے بارے میں یہ بات اس لیے کہی جاسکتی ہے کہ وہ ایک مدت سے معزز پیشۂ درس و تدریس سے وابستہ، اس سیر گاہ کے قدیم جادہ پیما اور اسکول کے پرنسپل ہیں۔ اس سے قبل انھوں نے بچوں کے لیے سچی کہانیاں سیریز، انبیائے کرام سیریز، اچھے بچے سیریز وغیرہ عناوین سے درجنوں کتابچے لکھ کر ادب اطفال کے میدان میں اس قدر شہرت حاصل کرلی ہے کہ ان کو بجاطور پر اس خطے کا آج کا مائل خیر آبادی کہا جانے لگا ہے۔ انھوں نے بہت دنوں کے بعد اس خلا کو پر کرنے اور باد مخالف میں دیا جلانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔

آج کل بچوں کے گرد و پیش، پاس پڑوس بالخصوص عصری تعلیم کی حامل درس گاہوں میں جو ماحول نظر آتا ہے اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان سے عقائد یعنی اللہ، رسول، فرشتوں یا آخرت وغیرہ پر یقین مضبوط ہو گا یا عبادات نماز، روزہ کے احکام وغیرہ پر عمل کا جذبہ پیدا ہو گا؟۔ ایسے میں زیر نظر کتاب میں سچے واقعات کو کہانی بنا کر دلچسپ انداز میں پیش کرنے کی کوشش بہت مناسب ہے۔ باجی کی زبان سے معبود کی جو پہچان سورہ اخلاص کی روشنی میں بچوں کے معصوم ذہنوں تک پہنچائی گئی ہے اس سے آسان اور سادہ انداز میں عقیدۂ توحید کو منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور جمعہ وغیرہ جیسے ارکان اسلام کی اہمیت بچوں کے ذہنوں میں اتارنے کے لیے صلوبابا، رمضان بابا، خیراتی بابا، حاجی بابا اور جمن بابا کی دلچسپ تعبیر اختیار کرکے ان کی اہمیت دلوں میں اتار دینے کا عمل بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے۔ اس سے بچے نہ صرف اپنی اسلامی تاریخ اور شاندار روایات سے واقف ہوں گے بلکہ ان کے اندر اسلامی شعور اور حقیقت شناسی کا جذبہ پیدا ہو گا اور ان کی اخلاقی تربیت اور کردار میں انقلاب پیدا ہو گا۔ یقیناً یہ ایک بابرکت اور مستحسن قدم ہے۔ البتہ بعض مقامات پر الفاظ مزید آسان کیے جاسکتے تھے۔ (ک، ص اصلاحی)

ڈاکٹر عارف الیاس ندوی، ارمغان میوات، استاذ العلماء عبدالسبحان خان میواتی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت ، مجلد مع گردپوش، صفحات: ۵۳۶، قیمت: ۶۰۰ روپے، سن اشاعت ۲۰۲۴ء، پتہ: جامعہ صدیقیہ، عین العلوم، نوح، میوات، ہریانہ اور نوح ہی کی جامعہ معین الاسلام اور جامعہ عربیہ نصرت الاسلام، موبائل نمبر: ۹۸۱۱۸۶۷۳۹۵

صدیوں سے دارالحکومت دہلی کے جوار اور گویا سایہ میں علاقہ میوات کا وجود گویا تاریخ وجغرافیہ کی بوالعجبی کی مثال ہے۔ دہلی ہندوستان کی تمام تہذیبی، تمدنی، علمی، عسکری، سیاسی، تحریکی اور دینی و مذہبی سرگرمیوں، ترقیوں اور عروج و زوال کی کہانیوں کا سرعنوان بنتی رہی، تہذیبوں اور

ثقافتوں کے قافلے یہیں سے اٹھتے اور اودھ، مرشد آباد، بھوپال، حیدرآباد اور میسور اور آرکاٹ تک دہلی کی اس رنگارنگ ثقافت کی دولت عام کرتے رہے جو خدا جانے کتنے ملکوں اور تہذیبوں کی آمیزش سے خود ایک نئے خزانے کا پتہ دیتی تھی۔ لیکن اسی دہلی کی ناک کے نیچے میوات کا علاقہ اپنی خاص قوم کے ساتھ گویا بزم تیموریہ اور اس سے پہلے بزم سلطنت کی جلوہ سامانیوں سے محروم ہی رہا۔ جو قوم محبت و رواداری، مہمان نوازی اور خودداری اور وفاداری کے فطری اوصاف کی حامل تھی وہ خدا جانے کیوں بائیس خواجوں کی چوکھٹ سے چند میل کے فاصلہ پر رہتے ہوئے بھی دینی، علمی اور سیاسی رہبری کی صلاحیتوں کا اظہار نہ کر سکی۔ اوصاف اور انسانی بنیادی خوبیوں میں بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی یہ قوم ان عربوں کی یاد دلاتی ہے جن کی پہچان دور جاہلیت سے کی گئی۔ ایسی جفاکش، ایمان دار اور سب سے بڑھ کر خوددار قوم سے ملک و ملت کو سرخ رو ہونے کی ضرورت تھی۔ البتہ خود کو پہچاننے میں میواتی قوم نے کبھی کوتاہی نہیں کی، اس کا ثبوت اس خطہ کی وہ خاموش تاریخ ہے جس نے صدیوں اپنے امتیازات کی پاسداری کی، مگر یہ بھی ضرور ہے کہ اس قوم کو پہچاننے میں بقیہ ہندوستان سے ضرور کوتاہی ہوئی۔ جب تعارف ہوا اور یہ بڑی مبارک نسبتوں سے ہوا، یعنی مولانا محمد الیاس کاندھلوی اور ان کی تبلیغی محنتوں کے سایے، میواتی قوم پر دراز ہوئے۔ اس نے یہاں کی قوم کو گویا پھر سے مسلمان کر دیا۔ اس عہد تجدید کی نمایاں ترین شخصیت مولانا عبدالسبحان خاں کی تھی۔ مولانا ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی دور ہے جس میں بقول مولانا سید سلیمان ندوی پورے ہندوستان پر خون کی بارش ہو رہی تھی، اس خونی تراوش میں کچھ بوندیں یاقوت میں ڈھل گئیں۔ مولانا عبدالسبحان بھی ایسے ہی ایک یاقوت بن کر چمکے۔ اور یہ محض شاعری یا مبالغہ آرائی نہیں، ایک محقق کی زبان میں وہ گراں مایہ استاد، فاضل معلم، مشفق مربی اور علوم و فنون میں کامل، تربیت و تہذیب سے مالا مال اور زندگی کے ہر گوشہ علم و اخلاق میں اپنی مثال بن گئے۔ افسوس ایسی جامع الصفات ہستی کے کمالات کو شایان شان بیان نہیں کیا گیا۔ زیر نظر کتاب کے مرتب اور ان کے تمام نوجوان رفقاء واقعی تبریک کے ساتھ شکریہ کے حقدار ہیں کہ انہوں نے میوات کے عہد جدید کے سب سے بڑے معمار کی یادوں کو زندہ کرنے اور رکھنے کے لیے ایک بڑے وقیع مذاکرۂ علمی کا اہتمام کیا اور اس موقع پر مولانا میواتی کے سوانح پر مشتمل بہترین تحریروں کا ایک مجموعہ بھی پیش کر دیا۔ اس کتاب نے بتایا کہ اہل نظر نے کیوں مولانا میواتی کو میوات کا شاہ ولی اللہ قرار دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ برصغیر کی تاریخ میں کوئی شاہ ولی اللہ ثانی نہیں کہلایا۔ یہ اعزاز اگر مولانا میواتی کو ملا تو کوئی بات تو تھی۔ یہی بات اس کتاب میں کھل کر اور تفصیل سے بتا دی گئی۔ ان کی حیات،

خدمات، ان کے خانوادے، ان کے تلامذہ، ان سب کے ذکر نے صرف مولانا میواتی ہی نہیں، پورے میوات کی عظمتوں کو تلاش کر لیا۔ حکیم سید ظل الرحمٰن، مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا بلال عبدالحی حسنی، مولانا کلیم صدیقی، مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی، پروفیسر محمد نعمان خاں، مولانا عبداللہ طارق، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، مفتی مشتاق تجاروی، ڈاکٹر طارق ایوبی تو بڑے نام ہیں، خوشی اس کی ہے کہ نوجوان اہل قلم اور بیشتر میواتی فضلاء نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے مضامین کی تیاری کی۔ خود مرتب اور ان کے ساتھ حیدر میواتی اور مفتی محمد نسیم میواتی ندوی نے قلم کے جو جوہر دکھائے وہ اصلاً میوات کے مستقبل کے روشن ہونے کی علامت ہے۔ اس کتاب سے یقین ہو جاتا ہے کہ میوات کو ہم پلہ غزنہ وہرات کہنا محض مبالغہ آرائی نہیں۔ (عمیر الصدیق ندوی)

شکیل اعظمی، آگ سے بچھڑا دھواں: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۳۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۳ء، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی اور ملک کے ممتاز و مشہور مکتبے۔

تضاد صفات کا بیک تعبیر اظہار اگر کسی نام کے معنوی حسن کی علامت ہے تو اعظم گڑھ کا موضع سیدھا سلطان پور اس خیال کی تائیدی شہادت ہے، سیدھا پن اور سلطانی کی اسی مٹی کی ایک پہچان شکیل اعظمی ہیں، ان کو یہ دونوں خوبیاں، زندگی نے جس طرح عطا کیں، وہ ان کے پہلے مجموعہ اشعار دھوپ دریا سے زیر نظر مجموعے تک ان کی سب سے قیمتی متاع کی شکل میں سامنے آتی رہی۔ اعظم گڑھ، ممبئی، بڑودہ، بھروچ، سورت یا پھر مذہب، ادب شعر، فلم سارے جلوے اسی متاع سفر کا حاصل بنتے گئے۔ شاعری کے بے شمار رنگ ہیں لیکن اصل تو لہو رنگ ہے۔ پہلے مرحلہ میں ماں کے تعلق سے جس شاعری نے شکیل کی شناخت قائم کر کے ان کے احساسات کی آگ کو ہوا دی تھی اس کی حرارت آج بھی برقرار ہے۔ خود کو آگ سے بچھڑا دھواں کہہ کر آگ کے وجود کا انکار نہیں کیا گیا۔ اس مجموعہ میں سینکڑوں غزلیں ہیں، نامور نقاد پروفیسر عتیق اللہ نے ان غزلوں سے مکالمہ کر کے شرح و بیاں کا نیا ڈھنگ بھی سکھادیا۔ یہ مجموعہ اپنی قدر و خوبی کے لیے درحقیقت ایک طویل بیانیہ چاہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دو شعر شروع ہی میں ساری داستان سناگئے، عقیدت اور محبت دونوں کے اظہار کی جدت، سمجھنے کے لیے کافی ہیں:

یہاں کون تجھ سے محبت کرے گا محمدؐ کے جیسی
پرائے وطن میں بہت دن گزارے ہیں تونے او پیارے

نگاہوں میں سب کی ہوس کا ہے جنگل یہاں سے نکل چل
بلاتا ہے تجھ کو دعاؤں کا آنچل یہاں سے نکل چل

(ع۔ ص)

معارف کی ڈاک

روضۃ الاولیا اور دیگر مضامین

معارف جنوری ۲۰۲۵ پیش نظر ہے۔ اس حُسن انتظام اور خوبی کی داد دینا چاہیے کہ منتظمین کی مساعی سے رسالے کا ڈیجیٹل نسخہ بروقت مہینے کے آغاز پر ہی مل جاتا ہے۔ لیکن رسالے کے معنوی معیار کو بھی بلند تر کرنے کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے مضامین جس شکل میں دفتر معارف میں موصول ہوتے ہیں، انھیں ماہرین سے پڑھوائے بغیر یا ان سے رائے لیے بغیر ہی چھاپ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ مجلس ادارت میں ماہرین کے اہم نام شامل ہیں جو فارسی، عربی ادب اور تاریخ کے مضامین پر رائے دے سکتے ہیں۔

اب مضمون ”روضۃ الاولیاء کی تاریخی و ادبی اہمیت“ از ڈاکٹر نصرت انصاری کو ہی لیجیے اس کی پہلی دوسطروں میں تین فحش غلطیاں ہیں۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کا نام آزاد حسین بلگرامی، ان کی تصنیف خزانہ عامرہ کو فرہنگ عامرہ اور گراں بہا کو گراں بہاں لکھا ہے (ص ۴۳)۔ پورا مضمون روا روی میں لکھا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی طالب علم کی امتحانی مشق ہو۔ مضمون نگار نے سنین درج کرنے کا اہتمام کیا ہے نہ حوالے مکمل دیے ہیں۔ آزاد بلگرامی کا زمانہ حیات (۱۱۱۶-۱۲۰۰ھ) تک نہیں لکھا۔ ایک جگہ معارج الولایت کا حوالہ ہے (ص ۴۵)، یہاں لکھنا چاہیے تھا کہ یہ عبداللہ خویشگی قصوری کی تصنیف ہے اور اب عکسی شائع ہو چکی ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے 'فرشتہ کا بیان ہے' (ص ۴۶) فرشتہ کون ہے اور یہ بیان کہاں مذکور ہے؟ یا 'موسی خان جرأت کہتا ہے' (ص ۴۶) یہ جرأت کون ہے اور کہاں کہتا ہے؟

مضمون نگار نے روضۃ الاولیا کی دو اشاعتوں (۱۳۱۰ھ اور ۱۹۹۶ء) کا ذکر کیا ہے لیکن حواشی میں اشاعت کی کہیں کچھ وضاحت نہیں کی۔ یہاں یہ بتانا بھی مناسب ہو گا کہ روضہ کی دو اور اشاعتیں بھی ہیں۔ اورنگ آباد سے ایک ہی سال (۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۳ء) میں روضۃ الاولیا دو بار چھپی۔ ایک طباعت مطبع اعجاز صفدری سے ہوئی، جس کا ذکر مضمون نویس نے کیا ہے، دوسری مطبع خبیر سے ہے۔ ایک اور اشاعت رسالہ منادی، دہلی، سال ۱۹۹۲ء، جلد ۶۷، شمارہ ۴-۵ میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے اردو ترجمے کے ساتھ ہوئی۔ یہی متن اور ترجمہ بعد میں ۱۹۹۶ میں رامپور سے جداگانہ کتابی صورت میں شائع ہوا جس کا مضمون نویس نے ذکر کیا ہے۔ مضمون نویس نے ایک جملہ اپنی طرف سے لکھا ہے: 'اس تصنیف [روضۃ الاولیا] کو اگر صوفیہ کا تذکرہ یا مختصر سا رسالہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔' (ص ۴۳) صوفیہ کا تذکرہ تو بجا، مختصر رسالہ ہونے کی کیا تخصیص ہے؟ یہ

بات 'صوفیہ کا مختصر تذکرہ' لکھ کر بیان ہو سکتی تھی۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ یہ اس وقت کی تصنیف ہے جب مصنف خلد آباد گئے (ص ۴۳)۔ یہاں موقع تھا کہ مضمون نگار کی طرف سے اس کا سال تصنیف (۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) بھی بیان کر دیا جاتا۔

مضمون میں درج فارسی اقتباسات اور اسماء میں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں جیسے: ص ۴۳ پر درج ایک غلط عبارت کی درست شکل یوں ہے: 'بہ قدر امکان اداسازیم، واللہ المستعان۔' ص ۴۴ پر امیر حسن دہلوی کو امیر حسین دہلوی لکھا ہے۔ ص ۴۵ پر سید محمد گیسو دراز کی جگہ سید محمود لکھا ہے۔ ص ۴۵ پر ایک جملہ ہے: 'گلو کے ساتھ وجد و رقص بھی کرتے تھے۔' اس سے کیا مراد ہے؟ گلے کے ساتھ گایا تو جاسکتا ہے وجد و رقص کیسے ہو سکتا ہے؟ ص ۴۵ اہل بیت کو اہل بیعت لکھا ہے۔ اسی صفحے پر معارج الولایت کو معارف الولایت لکھا ہے۔ ص ۴۶ پر موسوی خان جرات کو موسی خان جرات لکھا ہے۔ ص ۴۷ پر ایک جملہ ہے: 'کہیں کہیں باوزن الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے'، سوال یہ ہے کہ کیا بے وزن الفاظ بھی ہوتے ہیں؟ دراصل یہاں مضمون نگار یہ کہنا چاہتی ہیں کہ کہیں کہیں مسجع الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

معارف کے اس شمارے میں رسالہ اختیار پر کلیم صفات اصلاحی صاحب کے مضمون کے حوالے سے یہ مزید اطلاع دی جاتی ہے کہ سلامت علی خان معروف بہ حذاقت خان کا یہ رسالہ دوبار طبع ہوا تھا۔ پہلی بار ۱۲۴۴ھ میں کلکتہ سے بہ اہتمام مولوی عبد الرحیم، جس کا حوالہ مضمون میں موجود ہے، دوسری بار ۱۲۶۷ھ میں مطبع کرامت علی موسوی حیدر آباد دکن سے چھپا۔

عارف نوشاہی (اسلام آباد)

naushahiarif@gmail.com

معارف دسمبر ۲۰۲۴ء کے توسط سے مختلف ابعاد و جہات لیکن غالب تعلیمی مندرجات محتویات اور مشتملات پر مبنی آپ کا سفر نامہ معنون "ترکی میں آٹھ یادگار دن" پڑھنے کو ملا جسے خوب ڈوب کر پڑھا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تعلیم و تعلم سے اشتغال رکھنے والوں کے لیے یہ رہنما خطوط فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک طرف جہاں عالم اسلام کے ساتھ ساتھ عالم انسانی کے تعلیمی مزاج و منہاج، کیف و کم، پیچ و خم اور زیر و بم سے روشناس کراتا ہے تو وہیں دوسری طرف تعلیمی تحریکات و نظریات تصورات و تطورات اور آراء و افکار سے بھی باخبر کرتا ہے۔ بہر کیف یہ آٹھ روزہ سفر نامہ ثقافتی نظریے کے منجمد نہ ہونے کا اعلامیہ بھی ہے اور بدلتے تعلیمی تقاضے و طالب کا اشاریہ بھی ہے جس سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔

راجو خان، سیکر (راجستھان)

miakhirwa@gmail.com

دارالمصنّفین کے لیل ونہار

"دی گلوریَس قرآن" کا اجراء

ناظم دارالمصنّفین ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے "دی گلوریس قرآن" کے نام سے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ۲۰۲۳ء کے اواخر میں ۱۱/ سال کی محنت کے بعد شائع کیا تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن چند مہینوں میں ختم ہوگیا تھا۔ پھر دوسرا ایڈیشن بھی جلد ہی ختم ہوگیا۔ اب تیسرے ایڈیشن کی تیاری ہے۔ مترجم کی طویل علالت اور غزہ پر جاری اسرائیلی درندگی کی وجہ سے اس کا اجراء نہیں ہوا تھا۔ اب اس کی رسم اجراء کی پہلی تقریب دارالمصنّفین کے کانفرنس ہال میں علما و اعیان شہر کی موجودگی میں ۱۱/ جنوری ۲۰۲۵ء کو بعد نماز مغرب منعقد کی گئی۔ تقریب کی صدارت سابق ناظم جامعۃ الفلاح مولانا محمد طاہر مدنی اور نظامت مولانا عمیر الصدیق ندوی دریابادی نے کی۔ مہمان خصوصی مولانا محمد عامر رشادی ناظم جامعۃ الرشاد تھے۔ فضل الرحمٰن اصلاحی نے علامہ شبلی اور دارالمصنفین کی خواہش اور کوشش پر روشنی ڈالی کہ ایک عمدہ انگریزی ترجمۂ قرآن پاک تیار کیا جانا چاہئے۔ راقم الحروف کے مختصر تعارف مترجم کے بعد مترجم نے اس ترجمے کے منظر عام پر آنے سے پہلے کی تفصیلی روداد اوراس کی خصوصیات سے حاضرین کو آگاہ کیا۔ مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی استاذ تفسیر مدرسۃ الاصلاح نے "قرآن مجید سے رشتہ کیوں کر استوار کیا جائے" کے موضوع پر مفصل گفتگو کی۔ تاثرات کے لیے مولانا محمد عامر رشادی، ماہر شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ڈاکٹر جاوید اختر (مشہور سرجن)، پروفیسر سرفراز نواز (شعبۂ انگریزی شبلی کالج)، ڈاکٹر محمود مرزا حافظ عبد الرب (اسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ عربی الٰہ آباد یونیورسٹی) اور ڈاکٹر عبد اللہ (رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنّفین، مقیم حال امریکہ) کو دعوت دی گئی۔ ان تمام حضرات نے اس ترجمۂ قرآن کے متعلق مثبت رائے دی اور مترجم کو اس اہم قرآنی خدمت پر مبارک باد پیش کی۔ صدارتی خطاب میں مولانا محمد طاہر مدنی نے کہا کہ آج کی اس بابرکت مجلس میں شرکت ہماری خوش بختی ہے۔ انہوں نے ترجمہ کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہر زبان میں ایک مدت کے بعد کچھ نہ کچھ الفاظ متروک ہوجاتے ہیں لیکن قرآن پاک کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس میں جو لفظ آیا ہے وہ تاقیامت باقی رہے گا، کبھی متروک نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان کے ترجمے کے متعلق انھوں نے کہا کہ یہ بہت اہم خدمت ہے جو ڈاکٹر صاحب نے انجام دی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ ان شاء اللہ اس ترجمے کو قبولِ عام حاصل ہوگا۔ اس موقع پر مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الفلاح، جامعۃ الرشاد، شبلی کالج کے اساتذہ، دارالمصنّفین کے کارکنان اور شہر کے عمائدین موجود تھے۔ (ک۔ ص اصلاحی)

رسید کتب موصولہ

مولانا سید جلال الدین عمری، *Glimpses from Sirah of Prophet Muhammad* (SAWS) ”اوراق سیرت“ کا انگریزی ترجمہ، مترجم: پروفیسر عبد الرحیم قدوائی، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ، صفحات ۴۰۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت ۳۰۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۰۲۷۴۴۵۹۱۹

محمد ہاشم علی المصباحی، الذکر المختصر فی القطب المزدھر (عربی): جیلانی بکڈپو، نئی دہلی، صفحات: ۲۶۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۸۳۸۳۶۰۹۳۰

پروفیسر سید علیم اشرف جائسی، ڈاکٹر محمد شاکر رضا (تالیف)، الھند فی الرحلات العربیۃ الحدیثۃ: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی: حیدر آباد، صفحات: ۳۵۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۷۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۷۰۴۹۶۷۶۹۴

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، بیان رفتگاں: سالم بک ڈپو، تکیہ ایک مینارہ مسجد، اعظم گڑھ، صفحات: ۲۳۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۶۵۳۰۲۶۳۸۸

مولانا سعید الحق قاسمی، تذکرۂ علمائے مئوناتھ بھنجن: مکتبہ نعیمیہ، صدر بازار، مئوناتھ بھنجن، صفحات: ۷۶۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۲ء، قیمت: ۱۰۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۵۰۷۵۵۸۲۰

عبد اللہ دروری، ڈی مارکیشن: اے شارٹ بایوگرافی آف شیخ خالد کمال عبد الحافظ (انگریزی): قاضی اطہر اکیڈمی، الجمعیۃ الحجازیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ، صفحات: ۳۵۱، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں، ای میل: qaziatharacademy@gmail.com

ڈاکٹر شاداب ذکی بدایونی، سرکار کی باتیں (دیوان نعت): ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، صفحات: ۱۹۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۹۷۰۴۸۱۵۰

مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری، سید المحدثین امیر المومنین فی الحدیث اور صحیح بخاری کی خصوصیات: جمعیۃ المعارف الاسلامیۃ، ٹیگور مارگ، نزد دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، صفحات: ۲۷۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت: ۲۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۸۴۷۷۸۸۰۰

محمد انوار الحق تبسم، عالمی تہذیب کی ترقی میں مسلمانوں کا عطیہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی، صفحات: ۱۷۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۷۸۲۷۳۰۸۰۹۳

ڈاکٹر اطہر حسین، ماہ نامہ معارف کی تحقیقی خدمات (عہد سلیمانی تک): ٹیگور مارگ، ندوہ کالج، ڈالی گنج، لکھنؤ، صفحات: ۲۹۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۹۴۵۶۷۸۶